آنچل
محی الدین نواب

ایک عیار اور مکار طوائف کا قصہ جو اپنی خباثتوں سمیت شریفوں کے محلے میں آبسی تھی۔

اس آنچل کے تقدس اور بے حرمتی کی کہانی جو قوم کی ماؤں بیٹیوں کے ننگے سر ڈھانپتا ہے۔

ان چکلوں کی کہانی جو "اس بازار" سے نکل کر گلی محلوں میں گندگی پھیلا رہے ہیں۔

وہ ایک بیماری کی طرح تھی جو شریف آدمی کو لگ جائے تو وہ مارے شرم کے علاج بھی نہیں کراسکتا۔

آنچل کے سائے میں عزت محفوظ رہتی ہے اور اسی آنچل کے سائے میں بدکاری بھی ہوتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے رومانی داستان اس طرح شروع ہوا کرتی تھی کہ ایک گوری چھیل چھبیلی سولہ سنگھار کیے پنگھٹ پر پانی بھرنے آتی تھی۔ تب ایک بانکا چھیل چھبیلا پردیسی اُدھر سے گزرتا اور جگ مگ کرتی گوری گھونگھٹ نکال کر صاف چھپتی بھی نہیں' سامنے آتی بھی نہیں۔ پھر شرماتے لجاتے ہوئے پوچھتی۔

"اجنبی! کیا پیاسے ہو؟ پانی پیو گے؟"

منصور نے جھجکتی ہوئی نظریں اٹھا کر گوری کو دیکھا۔ وہ سولہ سنگھار کیے میونسپلٹی کے نلکے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر سرخی لگی ہوئی تھی۔ رنگ گورا تھا لیکن چہرے کی گلابیت مصنوعی تھی۔ گوندھی ہوئی چوٹی پر موتیے کی کلیاں سجی ہوئی تھیں۔ بھرے بھرے بدن پر قمیض یوں تنگ ہو رہی تھی کہ یوں کسی اور نے اسے تنگ نہ کیا ہو گا۔ پانی سے بھری ہوئی بالٹی اٹھانے کے لئے اس نے شلوار کو پنڈلیوں تک اونچا کر لیا تھا وہ منصور کو دیکھتے ہوئے شرمائے جا رہی تھی۔

وہ شرمیلا تھا۔ کچھ شرم سے کچھ دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ کالج سے واپسی میں پیاس لگی تو نلکے سے ذرا دور ٹھہر گیا تھا۔ یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ گوری کے لئے رک گیا ہے مگر اس کی توجہ کے خلاف وہ خود ہی اسے مخاطب کر رہی تھی۔ "اگر پانی پینا ہے تو یہ رہا میرا گھر..........."

اس نے ایک ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ اس کا مکان پانچ چھ قدم کے فاصلے پر تھا۔ نلکے کے نیچے بالٹی پانی سے بھرتی جا رہی تھی۔ وہ ٹونٹی گھما کر نلکے کو بند کرتے ہوئے بولی۔

"آ جاؤ۔ میرے گھڑے کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ میرے ہاں کولر بھی ہے۔"

وہ بھری ہوئی دو بالٹیاں اٹھانے کے لئے جھکی۔ منصور نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ٹھہریئے' آپ میری یہ کتابیں سنبھالئے' میں پانی پہنچا دوں گا۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کتابیں لے لیں۔ منصور جھک کر دو بھری ہوئی بالٹیاں اٹھانے کے بعد سیدھا ہوا تو اس کا سینہ چٹان کی طرح اور پھیل گیا۔ گوری کی نگاہیں یوں پھیل گئیں جیسے ہائے' کہہ رہی ہوں' اس نے جلدی سے بڑھ کر مکان کا دروازہ کھولا۔ منصور بالٹیاں اٹھائے تیر کی طرح اندر چلا گیا۔ آنگن میں پہنچ کر گوری نے باورچی خانہ کی طرف راہنمائی کی۔ اس نے بالٹیاں وہاں لے جاکر رکھ دیں۔

آنگن میں گھنے درخت کا سایہ تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ ایک چھوٹی سی چوکی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہاں بیٹھو میں تمہیں ٹھنڈا میٹھا شربت پلاؤں گی۔ تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"میرا نام منصور احمد ہے۔" وہ آس پاس دیکھنے لگا۔ آنگن کے دو طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ تیسری طرف باورچی خانہ تھا۔ چوتھی طرف آنگن میں داخل ہونے کے دروازے کے ساتھ ایک اور کمرہ تھا۔ اس کمرے سے کسی مرد نے آواز دی۔ "اوصاف بیگم! کہاں ہو ذرا ادھر آؤ۔"

"ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ اس کمرے کی طرف جانے لگی۔ منصور نے پہلی بار توجہ سے محسوس کیا کہ وہ ایک عمر رسیدہ بھاری بھرکم عورت ہے اور اس پر بیگم جیسا نام جچتا ہے مگر اس نے ایسا چہکتا ہوا میک اپ کیا تھا کہ اس چیخ وپکار میں اصلی عمر چھپ گئی تھی۔

ویسے گرمی کی تپتی ہوئی دوپہر میں میک اپ کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ وہ میونسپلٹی کے نلکے تک پانی بھرنے گئی تھی۔ کسی فلمی پنگھٹ پر شوٹنگ کے لئے نہیں گئی تھی۔ کچھ یوں لگتا تھا کہ وہ بن ٹھن کر جس کے انتظار میں گئی تھی اسے اپنے آنگن میں لے آئی تھی۔ شاید اس قول کی تصدیق ہوگئی تھی کہ عورت جس سے چاہے اپنے ہاں پانی بھروا سکتی ہے۔

اوصاف بیگم اس کمرے میں داخل ہوئی۔ آنگن کے دوسری طرف جو کمرے تھے' ان میں سے ایک کا دروازہ کھلا۔ اس دروازے کے فریم میں ایک حسین دوشیزہ اک انداز بے نیازی کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ گرمی اور پسینے کے باعث اس نے بالوں کو سمیٹ کر

جوڑا باندھ لیا تھا۔ تازہ ہوا کھانے کے لئے دوپٹہ کمرے میں پھینک آئی تھی۔ اس موسم میں قمیض پہننے سے شاید گرمی دانے نکل آتے ہوں گے۔ اس لئے وہ صرف قمیص پہنے ہوئے تھی۔ منصور کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ اس نے اپنی کتابوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جیسے تہذیب اور تعلیم ہاتھ سے چھوٹی جارہی ہو۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی شرما کر واپس کمرے میں جائے گی' پھر ڈھنگ سے باہر آئے گی' لیکن اس نے کسی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "نورین! ادھر آؤ۔ بے بے نے نئے باورچی کا بندوبست کیا ہے۔"

منصور جھینپ کر سیدھا بیٹھ گیا کیونکہ وہی باورچی خانے کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ آس پاس ایسا کوئی نہ تھا جسے باورچی کہا جاتا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کن انکھیوں سے ادھر دیکھا۔ اب اس دروازے کے فریم میں دو دوشیزائیں نظر آرہی تھیں۔ دوسری نے لٹھے کی شلوار پر ململ کا کرتہ پہنا ہوا تھا۔ وہ بھی دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ چونکہ نورین کو آواز دے کر بلایا گیا تھا لہٰذا دوسری کا نام نورین ہوسکتا تھا۔ وہ اس کی طرف آتے ہوئے بول رہی تھی۔ "ہائے باجی! اس کے ہاتھوں میں کتابیں ہیں یہ باورچی نہیں ہوسکتے۔"

باجی صاحبہ بھی قریب آتے ہوئے بولیں۔ "پڑھنے لکھنے والے باورچی بھی تو ہوتے ہیں۔"

وہ دونوں اس کے پاس آئیں۔ منصور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا جیسے لڑکیاں گھبراہٹ میں دوپٹہ سنبھالتی ہیں' ویسے ہی وہ اپنی کتابیں سنبھال رہا تھا۔ نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ نورین نے کہا۔ "اللہ باجی! یہ کیسے شرما رہے ہیں۔ لگتا ہے ہم پر نظر ڈالیں گے تو جہنم کی آگ انہیں یہیں جلا دے گی۔"

وہ دونوں ہنسنے لگیں۔ منصور کے جبڑے سخت ہوگئے۔ اس نے دانت پر دانت جما کر انہیں دیکھا بلکہ گھور گھور کر دیکھا۔ پھر اچانک ہی نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "ہمارے ملک میں اسلامی نظام قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی فرداً فرداً عملی طور پر کوشش کریں۔ میں یہ بتادوں کہ عمل کرنے میں بہت زیادہ محنت ضروری نہیں ہے۔ بس اتنی سی گزارش ہے کہ ہم مذہب پر عمل کررہے ہیں تم لڑکیاں تہذیب

کے سر پر دوپٹہ رکھ دیا کرو۔"

نورین جھینپ کر اپنی باجی کو دیکھنے لگی۔ باجی نے ڈھٹائی سے کہا۔ "ہائے یہ ہماری بے بے کہیں سے مولوی کو پکڑ کر لے آئی ہیں۔"

"میں مولوی نہیں ہوں' معلم نہیں ہوں' ایک طالب علم ہوں جو اچھی باتیں سیکھتا ہوں' اسے دوسروں کو سکھانا چاہتا ہوں۔"

اتنے میں اوصاف بیگم ہاتھ میں شربت کا گلاس لیے کمرے سے باہر آئی مسکراتے ہوئے بولی۔ "اچھا تم تینوں آپس میں متعارف ہو رہے ہو؟"

باجی نے کہا۔ "بے بے! ان کے تعارف سے خدا بچائے۔ یہ تو مولوی ہیں۔ ہمیں دوپٹہ اوڑھنے کی نصیحت کر رہے ہیں۔"

اوصاف بیگم یہ سن کر ٹھٹک گئی۔ اس نے ایک ذرا تشویش بھری نظروں سے منصور کو دیکھا' پھر فوراً ہی سمجھوتے کے انداز میں بولیں۔ "منصور اچھی باتیں سمجھا رہے ہیں۔ دوپٹہ اوڑھ لو گھر میں کوئی مرد نہ رہے' تب اتار دینا۔"

لفظ "اتار دینا۔" کچھ اس طرح زور دے کر پلکیں جھپکا کر کہا گیا کہ لڑکیاں سمجھ گئیں کہ منصور کی تسلی کے لئے دوپٹہ پہنے اور سر پر رکھ لیا جائے۔ وہ کمرے کی طرف جانے لگیں' اوصاف بیگم نے کہا۔ "یہ میری بڑی بیٹی پروین ہے اور وہ چھوٹی بیٹی نورین ہے۔ بہت شریر ہیں تمہیں پریشان کیا ہو گا۔ یہ لو شربت۔"

وہ شربت کا گلاس لے کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں پریشان نہیں ہوتا۔ میرے والدین نے تعلیم دی ہے کہ بڑی سے بڑی بات تحمل سے برداشت کرلیا کرو۔"

"میں تمہارے والدین سے کبھی ضرور ملوں گی۔"

اس نے شربت کا ایک گھونٹ حلق سے اتارا۔ ایسی ٹھنڈک تھی کہ کلیجہ تر ہو گیا۔ مٹھاس بھی مناسب تھی۔ اتنی شدید گرمی میں شربت پینے کا لطف آ گیا۔ اس نے کہا۔ "آپ نے شربت کا تکلف کیا' ویسے لطف آ گیا۔"

وہ دوسری چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے آپ سے مخاطب نہ کرو' میں کوئی بزرگ ہستی نہیں ہوں۔ وہ تو کم عمری میں میری شادی ہو گئی تھی' اس لئے یہ لڑکیاں میری جوانی

ہی میں جوان ہو گئی ہیں۔"

اس نے حیرانی سے اوصاف بیگم کو دیکھا۔ وہ دل کھول کر مسکرا رہی تھی۔ "آج سے ہماری دوستی' تم روز آیا کرو۔ میں تمہارا نام لیتی ہوں' تم میرا نام لے سکتے ہو۔"

منصور نے دل میں سوچا۔ "اب کون کمبخت یہاں آئے گا بس یہ دو گھونٹ رہ گئے ہیں' گلاس خالی کر کے چلا جاؤں گا۔ تو مڑ کے نہیں دیکھوں گا۔"

اس نے سوچتے سوچتے گلاس خالی کر دیا۔ وہ گلاس اس نے اوصاف بیگم کو دے دیا اور جانے کی اجازت چاہنے والا تھا کہ اچانک آنگن کے دروازے سے بہار کا ایک خوشگوار جھونکا اندر آیا۔ منصور نے اسے دیکھا تو.......... دیکھتا ہی رہ گیا۔ اگرچہ وہ کسی لڑکی کی طرف نظریں اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا مگر وہ ایسی تھی کہ نظریں اسی کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ منصور کو جو حسن پسند آیا وہ یہ تھا کہ اس کے سینے پر دوپٹہ اور سر پر آنچل تھا۔

وہ سر پر آنچل سنبھالتے ہوئے پروین اور نورین کے کمرے کی طرف جانے لگی' اوصاف بیگم نے اسے آواز دی۔ "بھولی! ادھر آؤ' ان سے ملو' یہ منصور ہیں۔"

بھولی ان کی طرف درخت کے سائے میں آ گئی۔ اوصاف بیگم نے کہا۔ "منصور! اس کا نام.........."

"بھولی ہے۔" منصور نے بے اختیار تعریف کی۔ "ان کے چہرے پر ایسا بھولپن ہے کہ بھولی سے بہتر کوئی نام نہیں ہو سکتا۔"

وہ درخت کے تنے کی آڑ لیتے ہوئے بولی۔ "گھر والے مجھے بھولی کہتے ہیں۔ میرا نام قمر النساء ہے۔"

"نام کچھ ہی ہو' آئندہ ملاقات ہوئی تو میں بھولی کہہ کر ہی مخاطب کروں گا۔"

اوصاف بیگم نے پیار سے گھورتے ہوئے کہا۔ "آئندہ ملاقات کیوں نہ ہو گی؟ تم یہاں روز آؤ گے' روز ملاقات ہوا کرے گی۔ ہم زندہ دل لوگ ہیں' آپس میں مل بیٹھ کر اچھا وقت گزارنے کو برا نہیں سمجھتے۔ کیوں بھولی؟"

"ہاں بے بے آپ بہت اچھی ہیں' آپ نہ ہوتیں تو میں اپنے گھر کی چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر مرجاتی۔ ابو بھی آپ کے بڑے احسان مند ہیں۔"

اوصاف بیگم پیار سے ڈانٹ کر بولیں۔ "اچھا بس زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تمہارے ابو نے مجھے بہن بنایا ہے' تم میری بیٹی ہو پھر احسان کس بات کا؟ جاؤ' لڑکیوں کے پاس جاؤ۔"

وہ چلی گئی' جب تک وہ درخت کے پیچھے سے جھلکتی رہی تھی منصور اسے دیکھتا رہا تھا۔ اسے جاتے ہوئے بھی دیکھتا رہا۔ جب وہ کمرے کے اندر چلی گئی تو اس نے پوچھا۔

"یہ کہاں رہتی ہے؟"

اوصاف بیگم نے ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر پڑوس میں رہتی ہے۔ ماں مرگئی ہے باپ بوڑھا ہے کبھی اس کے پاس خوب پیسا تھا' خوب عزت تھی' اب بھی عزت دار ہیں مگر ریڑھے پر سبزیاں بیچنے والے کو کون پہلے جیسی عزت دیتا ہے' باپ بیٹی کا گزارا مشکل سے ہوتا ہے میں کبھی کبھی سو پچاس دے کر مدد کردیتی ہوں۔"

"آپ بہت اچھی ہیں' کیا میں بھی ان کی مدد کرسکتا ہوں؟"

وہ آہستگی سے بولی۔ "کبھی بھول کر بھی بھولی کے سامنے ایسی ہمدردی نہ جتانا۔ دونوں باپ بیٹی غیرت مند ہیں۔ وہ تو میں بہن بن کر زبردستی مدد کردیتی ہوں' اگر یہ تمہیں اچھی لگتی ہے اور تم دوستی کرنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ غیرت مند دوستی قبول کرلیتے ہیں مگر ہمدردی قبول نہیں کرتے۔ بھولی کے غرور کو ٹھیس پہنچے گی تو وہ تم سے بات بھی نہیں کرے گی۔"

یہ بات منصور کے دل کو لگی کہ غیرت مند دوستی قبول کرلیتے ہیں مگر ہمدردی قبول نہیں کرتے۔ بھولی نے پہلی ہی ملاقات میں اسے بے چین کردیا تھا۔ اب یہ بے چینی وقت کی طرح آگے بڑھنے والی......... اور کائنات کی طرح پھیلنے والی تھی۔ اس نے اسی وقت طے کرلیا کہ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کہے گا جس سے بھولی کے غرور کو ٹھیس پہنچے۔

اوصاف بیگم نے پوچھا۔ "کچھ اپنے بارے میں بتاؤ' کہاں رہتے ہو۔ آمدنی کا ایسا کون سا ذریعہ ہے کہ ابھی بھولی کی مدد کرنے کو تیار ہوگئے تھے؟"

"یہاں آگے نہر کے کنارے ہماری کوٹھی ہے۔ ابا ملازمت سے ریٹائر ہوگئے ہیں' بھائی جان سعودی عرب میں ہیں۔"

"اچھا تو وہاں خوب کماتے ہوں گے؟"

"جی ہاں' اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔"

"تم بھائی کی کمائی لٹاتے ہو؟"

"جی ہاں' ہمارے گھر میں سب ہی لٹانے والے ہیں میرے بھائی جان جو دور دیس میں بیٹھے ہیں' اگر ان سے کسی عزت دار گھرانے کی سفید پوشی کے لئے ہزار روپے مانگے جائیں تو دو ہزار بھیجیں گے۔ وہ مجھ سے زیادہ فیاض ہیں۔ میری تعلیم ختم ہوچکی ہے۔ آج میں آخری پرچہ دے کر آرہا ہوں۔ دو ماہ تک مجھے بھی باہر ملازمت مل جائے گی۔ ویسے آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟"

"وہ کھانستے ہیں اور بلغم تھوکتے ہیں کبھی کسی ٹھیکے دار کے ہاں منشی کا کام کرلیتے ہیں۔ ورنہ گھر میں پڑے رہتے ہیں۔"

"پھر گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں؟"

"پروین اور نورین بڑے گھروں میں ٹیوشن پڑھانے جاتی ہیں۔ میں تھوڑا بہت سلائی کا کام کرلیتی ہوں۔ عزت آبرو سے گزر ہورہی ہے کسی کی محتاجی نہیں ہے۔"

"آپ لوگوں کا بڑا حوصلہ ہے۔ اچھا اب میں چلوں؟"

"تم بار بار مجھے آپ کہہ کر رہے ہو' کیا ہم دوست نہیں ہیں؟"

منصور نے اس کمرے کی طرف دیکھا جہاں بھولی گئی تھی۔ اگر وہ اوصاف بیگم کی دوستی سے انکار کرتا' تو آئندہ بھولی سے ملنے کے مواقع نہ ملتے' اس نے کہا۔ "میں آپ کی عزت کرتا ہوں' آپ کہنا ہی مناسب ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میری عمر زیادہ ہے؟"

"جی۔ جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ آ۔ آپ تو پروین اور نورین کی بہن لگتی ہیں۔"

وہ خوش ہوگئی' اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "تو پھر آپ کیوں؟ تم کیوں نہیں؟"

"اچھا تم کہوں گا مگر شرط یہ ہے کہ نام نہیں لوں گا' باجی کہوں گا۔" وہ کچھ بجھ سی گئی۔ منصور اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہوگیا۔ جانے سے پہلے وہ بھولی کی ایک جھلک اور دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ لڑکیاں کمرے میں جاکر بیٹھ گئی تھیں۔ پتا نہیں کس مصروفیت میں ڈوب گئی۔

تھیں۔ منصور نے کل تک کے لئے صبر کیا۔ اوصاف بیگم اسے آنگن کے دروازے تک چھوڑنے آئی اور اس سے دوسرے دن آنے کا بار بار وعدہ لیا۔ وہ وعدہ کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہوگیا۔

اکثر شریفانہ ماحول میں بچے جوان تو ہوجاتے ہیں لیکن انہیں غیر ضروری جوانی کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں انہیں دینی اور دنیاوی تعلیمات میں مصروف رکھا جاتا ہے۔ منصور کو بھی اپنی جوانی کا احساس خصوصیت سے سے نہیں ہوا تھا لیکن بھولی کو دیکھتے ہی اس کی سوچ کو جوانی کے پر لگ گئے۔ وہ پرواز کرتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ اس کے ابا عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ امی کچن میں شام کی چائے تیار کر رہی تھی۔ چائے پینے کا وقت آیا تو وہ والدین کے سامنے جسمانی طور پر حاضر رہا۔ ان سے گفتگو کرتا رہا لیکن دماغی طور سے غائب رہ کر بار بار بھولی کے پاس پہنچتا رہا۔

چائے پینے کے بعد گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کوٹھی کے سامنے سو گز کے فاصلے پر نہر تھی' وہ نہر کے کنارے آکر بیٹھ گیا۔ اطمینان سے اس بات کا تجزیہ کرنے لگا کہ وہ اتنی اچھی کیوں لگ رہی ہے؟ اس نے بھولی کی صورت کو تفصیل سے نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس کی بڑی بڑی آنکھیں اسے یاد تھیں۔ شاید وہ آنکھوں پر عاشق ہوگیا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ درخت کی آڑ میں کیسی پیاری اداؤں کے ساتھ نظر آرہی تھی۔ وہ ان اداؤں سے محظوظ ہوسکتا تھا لیکن لفظوں میں ان کی تعریف بیان نہیں کرسکتا تھا۔ شاید ان اداؤں نے اسے جیت لیا تھا یا پھر وہ بول رہی تھی تو اس کی آواز کا ترنم اور لہجے کا دھیما پن دونوں ہی خوبیاں دل پر اثر کررہی تھیں۔

عجیب بات تھی کہ لوگ پہلے چہرے کے حسن پر مرتے ہیں اور اسے بھولی کا چہرہ یاد نہیں تھا اور وہ مر رہا تھا۔ بڑی دیر بعد اپنے گھریلو ماحول کے مطابق اسے یاد آیا کہ اس کی امی برابر اپنے سینے اور سر پر دوپٹہ رکھتی ہیں' بھولی کا یہی مشرقی حسن اسے پسند آیا تھا۔ صورت معمولی ہو' مگر آنچل کے سائے میں ہو تو مشرق کا حسن اسے دلکش بنا دیتا ہے۔

رات ہونے لگی۔ وہ نہر کے کنارے سے اٹھ کر کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ بھولی بھی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ سوچ کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ "تم تمام عمر اسی طرح

میرے ساتھ چلنے کے لئے پیدا ہوئی ہو۔"

ساتھ چلنے والی بھولی کے نورانی پیکر نے کہا۔ "میں غریب ہوں زیادہ دور تک ساتھ نہیں چل سکوں گی۔"

"ہاں مجھے یاد آیا کہ تم باپ بیٹی بڑی تنگی ترشی سے گزارہ کر رہے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تم سے شادی نہیں کروں گا اس وقت تک تمہارے گھر کے اخراجات پورے کرتا رہوں گا۔ شادی کے بعد تم میرے گھر میں راج کرو گی۔"

"آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ شادی سے پہلے آپ سے ایک پیسے کی مدد حاصل کرنا ہمارے لئے بے غیرتی ہے۔"

"لیکن تم میری ہو۔ میں تمہارے لئے کچھ کرنے کا حق رکھتا ہوں۔"

"میں نکاح سے پہلے آپ کی کچھ نہیں ہوں' آپ ہمارے اصولوں کو کمزور بنانا چاہتے ہیں' اب میں آپ سے نہیں ملوں گی۔"

اچانک منصور کو ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچا' بھولی غائب ہوچکی تھی' ناراض ہوکر چلی گئی تھی۔ امی نے دروازے پر سے پوچھا۔ "بیٹے کن خیالوں میں گم ہو۔ ذرا دیکھ کر چلو۔"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا۔ "امی میں آج بہت خوش ہوں لگتا ہے جیسے سارے جہاں کی خوشیاں مل گئی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" انہوں نے ممتا بھری مسکراہٹ سے کہا۔ "آج تمہارے سر سے موٹی موٹی کتابوں کا بوجھ اتر گیا ہے چند ماہ کے بعد تمہیں انجینئرنگ کا ڈپلوما مل جائے گا۔ پھر تم ملک سے باہر ایک وسیع دنیا میں جاؤ گے۔"

اس کے دل کی وسیع دنیا میں بھولی تھی اور امی وہاں جھانک کر اسے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں امی! میں آج رات بھائی جان کو خط لکھوں گا کہ اب وہ مجھے اپنے پاس بلالیں مجھے بھی اپنی ذمے داریاں سنبھالنے کے لئے کچھ کمانا چاہئے۔"

وہ لان میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "بیٹی کو رخصت کرنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ اب بیٹے ہیں اور ہمیشہ میرے پاس رہیں گے۔ میں نیک سیرت بہوئیں لاؤں گی

"مگر تم بھی اپنے بھائی جان کی طرح مجھ سے دور جانے کی خوشی میں مگن ہو۔"

منصور ایک دم سے سنجیدہ ہو کر ماں کے سامنے گھاس پر دو زانو ہو گیا۔ "امی! میں آپ سے دور جا کر کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ یہ تو حالات کا تقاضا ہے سبھی زیادہ آمدنی کے لئے ملک سے باہر جاتے ہیں۔"

"ہاں' پہلے والدین بیٹیوں کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرتے تھے' اب جوان بیٹوں کو پال پوس کر دور دیس کی طرف روانہ کردیتے ہیں اور اپنا بڑھاپا ویران کوٹھیوں میں گزارتے ہیں۔ کوٹھی' کار' ریڈیو' ٹی وی یہ سب کچھ رکھ کر ہم بوڑھے کیا کریں گے؟ ہم تو صرف اپنی اولاد کو آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں جمیل کو ہم سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے لیکن وہ باہر کمانے پر تلا ہوا ہے۔ برس دو برس میں اپنی صورت دکھا دیتا ہے۔ بیٹے! تمہیں تو ہمارے پاس رہنا چاہئے؟"

وہ ماں کو تک رہا تھا۔ ممتا کا نور اس کی آنکھوں اور دل میں اتر رہا تھا۔ اس نے کئی بار کہا تھا۔ "امی! میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔" لیکن آج بھولی کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ جمیل بھائی جان بھی اکثر لکھ بھیجتے تھے کہ اسے ملک سے باہر نکل کر اپنی صلاحیتوں کو آزمانا چاہئے اس کے ابو ہر حال میں مطمئن رہنے کے عادی تھے' بیٹے کہیں بھی رہیں' اچھے صحت مند اور سلامت رہیں لیکن امی کی ممتا نہیں مانتی تھی۔ تمام اولاد کو آنکھوں کے سامنے سمیٹ کر رکھنا چاہتی تھیں۔

اس نے اسی دم فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "امی! میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

امی خوش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے وقت یہ خیال ستاتا رہا کہ بھولی کی خاطر اسے اپنی جیب میں کچھ نہ کچھ رقم رکھنا چاہئے۔ پتہ نہیں محبوبہ کس وقت اس کا سہارا لینے کے لئے راضی ہو جائے۔ وہ اپنی امی سے کسی وقت بھی اچھی خاصی رقم لے سکتا تھا مگر کب تک؟ بھولی کے لئے تو اسے خود ہی کچھ کرتے رہنا تھا۔ اس لئے اب زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر پڑ گئی تھی اور آج کل زیادہ کمائی ملک سے باہر ہو رہی تھی۔

پتہ نہیں کتنی رات بیت گئی' تب اسے خیال آیا کہ وہ جاگ رہا ہے اور وہ نیند

اڑانے کا سحر پھونکتی جارہی ہے' اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ وہ یک طرفہ محبت کی آگ میں سلگتا جارہا ہے۔ وہ تو گہری نیند سو رہی ہوگی۔ وہ اس کے خیال میں ہو گا نہ خواب میں اور وہ خواہ مخواہ ابھی سے رات کی نیند حرام کر کے خیالی رومانس میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس نے سونے کی کوشش کی' معلوم نہیں کتنی دیر بعد بڑی مشکلوں سے نیند آئی۔

دوسرے دن تقریباً دس بجے وہ گھر سے نکلا۔ اوصاف بیگم کی طرف جاتے ہوئے وہ ہچکچا رہا تھا کیونکہ اس عورت سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس کے دروازے پر جانے کا کوئی معقول جواز نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات تھی کہ اوصاف بیگم نے بار بار آنے کے لئے کہا تھا لیکن اس گھر کے مرد نے وہاں قدم رکھنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ حماقت یہ ہوئی تھی کہ منصور نے اس گھر کے مرد سے ملاقات ہی نہیں کی تھی۔ اپنی آنکھوں میں بھولی کی آنکھیں بسا کر چلا آیا تھا۔

وہ میونسپلٹی کے پنگھٹ کے قریب پہنچنے لگا۔ نلکے سے ذرا دور آنگن میں کھلنے والا دروازہ بند تھا۔ منصور یہ سوچتا ہوا وہاں سے گزرتا چلا گیا کہ دروازے پر دستک کیسے دے؟ اور وہاں کس بہانے سے جائے؟

آگے جانے کے بعد وہ پلٹ گیا کیونکہ دروازہ بہت پیچھے رہ گیا تھا کوئی بھی شریف آدمی بے مقصد کسی غیر کے دروازے پر نہیں جاتا۔ جانے کے لئے کوئی تو بات ہونی چاہئے۔ اگر اوصاف بیگم نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔ "آؤ' کہو کیسے آنا ہوا؟" تو وہ کیا جواب دے گا۔

وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا کیونکہ دروازہ پھر پیچھے رہ گیا تھا اور وہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات تھی کہ اس گھر کی کوئی رہنے والی اسے وہاں سے گزرتے دیکھے اور خود ہی اسے آواز دے کر بلالے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کنواں خود پیاسے کو بلاتا ہو۔ البتہ پیاس بلاتی ہے اور یہ پتہ نہیں تھا کہ بھولی بھی پیاسی ہے یا نہیں؟

اچانک وہ لاٹری کی طرح تقدیر کے دروازے سے نکل آئی۔ اوصاف بیگم کے پڑوس کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ سر پر آنچل سنبھالتے ہوئے اور منصور پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اوصاف بیگم کے دروازے تک گئی۔ پھر سر گھما کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں

سوال تھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ "آپ میرے دروازے کے سامنے کیوں ٹہل رہے ہیں؟"

وہ دروازہ کھول کر اندر گئی۔ آنگن میں قدم رکھتے ہی پھر بولتی نظروں سے دیکھا۔ "آ بھی جاؤ' اب تو میں نے دروازہ کھول دیا ہے۔"

عجب خاموشی تھی کہ گونگی آنکھیں بول رہی تھیں۔ وہ اندر چلی گئی۔ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ آگے بڑھا اسے دیکھ لینے کے بعد واپس جانا مشکل تھا۔ ایسے ہی وقت پتہ چلتا ہے کہ محبت مقناطیس کی طرح کیسے کھینچ لیتی ہے۔ وہ دروازے پر پہنچا تو اوصاف بیگم کمرے سے نکل کر آرہی تھی اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "بھولی نے بتایا کہ تم آئے ہو' آجاؤ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔"

باورچی خانے کی آدھی دیوار کے اس پار بھولی چولہے کے پاس بیٹھی بڑی سی کڑاہی میں چمچ چلا رہی تھی' وہیں سے بولی۔ "بے بے میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی' یہ صاحب بڑی دیر سے ہمارے گھر کے سامنے ٹہل رہے تھے' میں یہاں دروازہ کھول کر نہ آتی تو شاید یہ اب بھی نہ آتے۔"

وہ جھینپ کر بولا۔ "میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ دروازہ آپ ہی آپ میرے لئے کھلتا ہے یا نہیں۔"

اوصاف بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔ "دروازہ آپ ہی آپ بھلا کیسے کھل سکتا ہے؟"

"باجی! ایک جذبہ ہوتا ہے' جو محبت کی کھڑکی سے جھانکتا ہے اور دوسرے بے قرار جذبے کو دیکھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔"

"ہوں۔" اوصاف بیگم نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے بھولی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اچھا' اب میں سمجھ گئی۔"

"آں؟" وہ ایک دم شرما کر بولی۔ "پتہ نہیں بے بے! یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کا مہمان سمجھ کر........."

"بس مجھ سے باتیں نہ بناؤ۔ تم نے دروازہ کھول کر گناہ نہیں کیا ہے' دروازے اپنوں کے لئے کھولے جاتے ہیں۔ آؤ منصور۔"

بھولی منہ پھیر کر پھر چمچ چلانے میں مصروف ہوگئی۔ منصور اوصاف بیگم کے ساتھ

آنگن سے گزرتا ہوا پروین اور نورین کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں تین نوجوان لڑکے نورین کے ساتھ کیرم کھیل رہے تھے۔ پروین ایک نوجوان سے لگی بیٹھی تھی اور کھیل کے دوران نوجوان کی حمایت میں کچھ نہ کچھ بول رہی تھی۔ اوصاف بیگم نے کہا۔ "کھیل ذرا روک دو پہلے منصور سے تعارف ہو جائے۔"

کھیل روک دیا گیا۔ سب لڑکے کھڑے ہوگئے۔ اوصاف بیگم نے کہا۔ "یہ منصور ہیں' دولتمند گھرانے سے تعلق ہے' ان کے بھائی سعودی عرب میں خوب کما رہے ہیں۔"

منصور کہنا چاہتا تھا کہ وہ دولتمند نہیں بلکہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ آج کل ہمارے ملک کی ہر چھوٹی بڑی سوسائٹی میں اسی حوالے سے تعریف اور عزت ہوتی ہے کہ بھائی اور باپ غیر ملک میں کماتے ہیں لہٰذا گھرانا دولتمند ہے بحیثیت پاکستانی ہماری کوئی تعریف نہیں ہے۔

اوصاف بیگم نے دوسرے جوانوں سے تعارف کرایا۔ "یہ اعظم ہے۔ اس کے ڈیڈی قالین کا کاروبار کرتے ہیں۔ ان کے قالین ہر ملک میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہ جاوید ہے۔ اس کے والد ریکروٹنگ ایجنٹ ہیں۔ لوگوں کو دبئی' بحرین' مسقط اور سعودی عرب وغیرہ بھیجتے ہیں یعنی انسانوں کے ایکسپورٹر ہیں۔ اور یہ آصف ہے' اس کے بھائی جان چمن میں انگوروں کے باغات کے مالک ہیں۔ یہ سب ہی دولت مند گھرانوں کے نوجوان ہیں۔"

منصور نے باری باری ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ جاوید نے کہا۔ "بھئی منصور! اب تم بھی روز ہمارے ساتھ دوپہر کا کھانا یہاں کھایا کرو گے آج یہاں کڑاہی گوشت تیار ہو رہا ہے۔ ذرا زور کی سانس کھینچ کر سونگھو۔ کچن سے یہاں تک خوشبو آئے گی۔"

یہ کہہ کر جاوید نے سونگھنے کے لئے زور کی سانس کھینچی۔ نورین نے فوراً ہی ایک چٹکی سے اس کی ناک دبادی۔ سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ ذرا سی دیر میں منصور ان لوگوں میں گھل مل گیا۔ نورین نے منصور کو کیرم کھیلنے کے لئے اپنی جگہ دی۔ آصف اس کا پارٹنر تھا اس نے کہا۔ "منصور! یہاں لمبی شرطیں لگائی جاتی ہیں۔ کل اعظم اور جاوید ہار گئے تھے' ان ہارنے والوں کی طرف سے آج کڑاہی گوشت اور پراٹھے تیار کئے جارہے ہیں۔ آج جو ہارے گا کل دوپہر کا کھانا اس کی طرف سے ہوگا۔"

اوصاف بیگم نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو ہمیشہ ان لوگوں کو منع کرتی ہوں کہ ایسی شرطیں نہ لگاؤ کہ روز یہاں دوپہر کا کھانا ہوتا رہے مگر یہ لڑکے لڑکیاں نہیں مانتے۔ مجھے کتنے ہی عرصہ سے اپنے گھر میں اپنے راشن سے پکانا نصیب نہیں ہوا۔ بڑے ضدی اور شریر ہیں یہ لوگ.........."

یہ کہہ کر وہ ہنستے ہوئے چلی گئی۔ وہ بڑی جہاں دیدہ تھی' اپنے ہاں آنے والوں کے مزاج کو سمجھتی تھی۔ منصور کا مزاج اور رجحان بھی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس لئے اس نے باورچی خانے میں جاتے ہی بھولی کو نوجوانوں کی محفل میں بھیج دیا تاکہ منصور آنکھیں سینکتا رہے۔

بھولی سچ مچ بھولی تھی۔ اس کے چہرے سے اور آنچل کے رکھ رکھاؤ سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ ایسی بے باک محفل میں بیٹھنے کی عادی نہیں ہے مگر عادی ہو رہی ہے کیونکہ پروین اور نورین بڑی گہری سہیلیاں بنی ہوئی تھیں اور اوصاف بیگم کے احسانات تھے۔ وہ وہاں آنے پر مجبور تھی۔ منصور نے رفتہ رفتہ معلوم کیا کہ وہ کیا تھی اور کیا سے کیا ہوتی جارہی تھی۔

ایک بجے بڑا سا دسترخوان بچھایا گیا۔ سب لوگ کھانے کے لئے بیٹھے۔ منصور نے محسوس کیا کہ اعظم بھولی سے قریب ہونے کی کوشش میں رہتا ہے لیکن اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دسترخوان پر کھانا چننے کے بعد بھولی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ کھانا اور لذیذ ہوگیا کیونکہ وہ اپنے نازک ہاتھ سے اس کی پلیٹ میں سالن ڈالتی اور پراٹھے پیش کرتی جاتی تھی۔ منصور نے خوب کھایا اور خوب باتیں کیں۔ بھولی کی یہ عادت تھی کہ ایک دو جملوں میں جواب دے کر چپ ہوجاتی تھی۔ دور بیٹھا ہوا اعظم کوئی نہ کوئی بات چھیڑتا تھا اور وہ شرمانے اور آنچل درست کرنے کے بہانے اس کی باتوں سے کترانے لگی تھی۔ چھیڑ چھاڑ کا بے باک سلسلہ جاوید' نورین اور آصف کے درمیان بھی تھا۔ یہ اندازہ ہوا کہ وہاں اپنی محبوبہ سے دل کی بات کہنے کے لئے تنہائی میں موقع نہیں ملتا ہوگا۔ بلکہ ایسی بھری محفل میں ذو معنی فقروں میں اپنے رقیبوں کے مقابلہ میں دل کا حال بیان کرنا پڑتا ہوگا۔

اور یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ بھولی فطرتاً شرماتی ہے یا ناگواری سے کتراتی ہے یا آداب محفل کا خیال رکھتے ہوئے ہر بات برداشت کرلیتی ہے۔ فی الحال اس کی قربت ہی منصور کے لئے اطمینان کا باعث تھی۔ اس کی نوجوانی میں وہ پہلا دن تھا کہ جو اسے پسند آئی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور ہم پیالہ نہ سہی' ہم نوالہ ضرور تھی۔ اس معنی میں کہ کبھی کبھی دونوں ایک ساتھ لقمے اٹھاتے تھے۔ دسترخوان پر کھانے والوں کی خوراک سے دوگنا کھانا تھا۔ پھر اوصاف بیگم رہ رہ کر یہ لقمہ دیتی جارہی تھی کہ کھانے میں تکلف نہ کیا جائے۔ ابھی باورچی خانے میں اور سالن اور پراٹھے رکھے ہوئے ہیں۔ اس پکوان سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ روزانہ دوپہر کو جتنی مقدار میں کھانا تیار ہوتا ہے' وہ اوصاف بیگم کے ہاں رات کے کھانے اور دوسری صبح کے ناشتے میں بھی کام آجاتا ہے۔ دوپہر کے تین بجے تک وہ محفل برخاست ہوجاتی تھی۔ تمام لڑکے دوسری صبح نو بجے تک آنے کے لئے وہاں سے رخصت ہوجاتے تھے۔

اس روز منصور اور آصف ہار گئے تھے۔ دونوں نے پچاس کا ایک ایک نوٹ نکال کر دیا تاکہ دوسرے دن دوپہر کی دعوت کا اہتمام ہوسکے۔ رخصت کے وقت ہر نوجوان آخر میں جانا چاہتا تھا تاکہ تنہائی میں اپنی کسی محبوبہ سے گفتگو ہوسکے۔ بظاہر سب آپس میں دوست تھے اور سب ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ اوصاف بیگم نے انہیں ایسا بنا رکھا تھا۔ وہ جوان چھوکروں کی نفسیات سے خوب واقف تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ پہلے رخصت ہونے والا لڑکا آنگن کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوجاتا تھا۔ تاکہ آخر میں کوئی فائدہ اٹھانے کے لئے نہ رہ جائے۔ کوئی رہ جاتا تو اسے پیار سے آواز دے کر باہر آنے پر مجبور کردیا جاتا۔ ان کے درمیان دوستی کے پیچھے رسہ کشی تھی۔ منصور کے لئے فکر کا مقام تھا کہ وہ اس بھیڑ میں بھولی کو اپنی طرف کیسے کھینچ سکے گا۔

اسے وہ ماحول پسند نہ تھا لیکن دل کی مجبوریاں تھیں۔ بھولی نے اسے آنچل میں باندھ لیا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی اور یہ کم گوئی بھی ایک پرکشش ادا بن جاتی تھی۔ وہ بلاناغہ وہاں جانے لگا۔ ایک دن اوصاف بیگم کے خاوند شرافت لطیفی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایسے شوہروں میں سے تھا جن کا نام شرافت ہی ہونا چاہئے۔ وہ چپ چاپ بیگم کی تخت

باتیں سن لیتا تھا۔ گھر میں جوان لڑکوں کی آمد و رفت فراخدلی سے برداشت کرلیتا تھا۔ وہ اکثر صبح گھر سے نکلتا تھا اور شام سے پہلے واپس نہیں آتا تھا۔ آتا بھی تو لڑکے لڑکیوں کے کمرے میں نہ جاتا۔ اوصاف بیگم جیسے اسے چابی دے کر چلاتی تھی۔

ایک ماہ بعد اوصاف بیگم نے منصور کو چپکے سے بتایا۔ ''بھولی کے ابو سخت پریشان ہیں۔ فٹ پاتھ پر سبزیاں بیچنے کے جرم میں پولیس والوں نے ساری سبزیاں پھینک دیں۔ ریڑھے کو تھانے لے گئے۔ جب تک وہ جرمانہ پانچ سو روپے ادا نہیں کریں گے انہیں ریڑھا واپس نہیں مل سکے گا۔''

وہ بولی۔ ''میں اکیلے تم پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ اعظم بھی کچھ مدد کر رہا ہے' کچھ تم بھی...........''

وہ رقابت سے سلگ کر بولا۔ ''نہیں باجی! میں بھولی کو اعظم کا احسان مند نہیں ہونے دوں گا۔ اب تو بنک بند ہو چکا ہے' کل صبح گیارہ بجے تک میں پانچ سو روپے لے آؤں گا۔''

''ویسے تو میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اعظم بہت چھچھورا ہے۔ ٹھیک ہے' میں اسے کہہ دوں گی کہ بھولی اور اس کے ابو کسی کی مدد قبول نہیں کریں گے' اور یہ درست ہے تم بھی بھولی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ میں تمہارے پانچ سو روپے خود ہی لے کر تھانے جاؤں گی اور خود ہی معاملہ ٹھیک کرلوں گی۔''

اس روز حسب معمول تین بجے سے پہلے محفل برخاست ہوگئی۔ بھولی صبح سے نظر نہیں آئی تھی۔ یقیناً اپنے گھر میں پریشان ہوگی۔ منصور نے اپنے گھر جاتے ہوئے سوچا کہ اپنے بینک اکاؤنٹ سے رقم نکالنے کے لئے کل تک انتظار کرنا ہوگا اور کل تک بھولی کی پریشانی بڑھتی رہے گی کیوں نہ امی سے رقم مانگی جائے۔

ماں نے مطالبہ سن کر پوچھا۔ ''پانچ سو روپے لے کر کیا کرو گے؟''

''پولیس والوں نے ایک غریب آدمی کا ریڑھا ضبط کرلیا ہے پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرنے کے بعد ہی وہ کل سے اپنا کاروبار کرسکے گا۔''

ماں نے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو بیچارے کو نئے سرے سے

سبزیاں بھی خریدنا ہوں گی۔ ایک ریڑھے پر سو دو سو روپے کی سبزیاں رکھی جاتی ہوں گی۔''

''شاید کچھ اتنی ہی رقم لگتی ہوگی۔''

ماں نے الماری سے سات سو روپے نکال کر دیئے۔ وہ ایسے والدین تھے کہ اپنے بچوں پر آنکھ بند کرکے اعتبار کرتے تھے اور بچوں کی پرورش ایسے ہوئی تھی کہ وہ والدین سے جھوٹ بھی نہیں بولتے تھے۔ منصور نے بھی ساری باتیں سچ بتائی تھیں۔ صرف بھولی کا ذکر نہیں کیا تھا اور یہ محض اس لئے کہ ماں باپ کے سامنے اپنی محبت کا ذکر کرتے شرم آتی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا' کہ بھولی کی طرف سے محبت کا اظہار ہوگیا تو وہ اپنی امی کو ایک کاغذ پر ساری روداد لکھ کر دے دے گا لیکن روبرو کچھ نہ کہہ سکے گا۔

وہ رقم لے کر اسی دن شام کو پانچ بجے اوصاف بیگم کے ہاں پہنچا۔ آنگن کا دروازہ لگا ہوا تھا مگر اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اب تو وہاں ایسی بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی کہ دستک دینا یا اجازت لے کر آنا ضروری نہیں ہوتا تھا۔ اس نے آنگن میں آکر دیکھا۔ پروین اور نورین کے کمروں کے دروازے پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ ٹیوشن پڑھانے جاتی تھیں۔ اوصاف بیگم کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے آنگن ہی سے آواز دی۔ ''باجی! کہاں ہو؟ یہاں تو دروازے بند پڑے ہیں۔''

اوصاف بیگم کے کمرے سے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ اندر سے بولی۔ ''منصور کیا تم آئے ہو؟''

''جی ہاں' میں منصور ہوں۔''

''اچھا آتی ہو۔ بس ابھی آئی۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔ منصور نے درخت کی چھاؤں میں جاتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کمرے سے کھسر پھسر باتیں کرنے کی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے باہر آئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے علاقے کا تھانیدار باہر آیا۔ وہ بولی۔ ''حشمت صاحب! یہ منصور ہے۔

بڑا شریف لڑکا ہے' ہمارے عزیزوں میں سے ہے اور منصور! یہ ہمارے علاقے کے تھانیدار حشمت صاحب ہیں۔"

منصور نے حشمت تھانیدار کو سلام کیا۔ اس نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے منصور کو گہری ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔ پھر موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب سرکاری ڈیوٹی کا وقت ہو چکا ہے۔ اوصاف بیگم کچھ مضطرب نظر آرہی تھی۔ وہ آنگن کا دروازہ بند کرنے کے بعد بولی۔ "کمرے میں چلو۔ میں شربت پلاؤں گی۔"

وہ کمرے میں آیا' اسے کچھ گڑبڑ سی لگ رہی تھی۔ شرافت لطیفی گھر میں نہیں تھا۔ اوصاف بیگم بند کمرے میں تھانیدار سے کیا باتیں کررہی تھی؟ منصور نوخیز جوان چھوکرا تھا۔ وہ کچھ سمجھ رہا تھا اور بہت کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ اوصاف بیگم نے شربت تیار کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم بے وقت کیسے آگئے؟"

"رقم کا انتظام ہو چکا ہے۔ یہ دینے آیا ہوں۔"

اس نے جیب سے سو سو کے سات نوٹ نکال کر سینٹر ٹیبل پر رکھ دیئے۔ وہ بولی۔

"تم تو زبان کے دھنی نکلے۔ میں ابھی یہ رقم لے کر تھانیدار کے پاس جاؤں گی۔ ابھی حشمت صاحب سے یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ تین سو میں کام ہو جائے گا۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا حشمت صاحب برابر یہاں آتے ہیں؟"

"نہیں کبھی کبھی آتے ہیں۔ دیکھو نا میرے ہاں جوان لڑکیاں ہیں اور تمہارے جیسے جوان لڑکے روز آتے ہیں اگر تھانیدار سے دوستی نہ رکھی جائے تو محلے والے ہمیں کبھی یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ ہمارے خلاف کوئی بات زبان سے نکالے۔"

اس نے گلاس میں شربت پیش کیا' پھر نوٹ گنتے ہوئے بولی۔ "یہ تو بہت ہیں۔"

"میں پانچ سو کے حساب سے لایا تھا' اب تین ہی سو میں کام ہو جائے گا۔ بھولی کے ابو کو نئے سرے سے سبزیاں خرید کر ریڑھا لگانا ہو گا۔ اس کے لئے دو سو لایا ہوں' اب پانچ

سو میں اس کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔"

اوصاف بیگم نے دو نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔ "یہ زیادہ ہیں۔"

منصور نے ان نوٹوں کو لیا۔ تصور میں بھولی شرما رہی تھی وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "باجی! آپ یہ دو سو روپے رکھ لیں اور اپنی طرف سے بھولی کے لئے ایک جوڑا سلوا دیجئے۔"

وہ مسکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "بھولی اکثر تمہاری باتیں کرتی ہے۔"

"اچھا۔" اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا کہتی ہے وہ؟"

"تعریفیں کرتی ہے کہ تم شریف لڑکے ہو۔ ویسے منصور! زیادہ شرافت اچھی نہیں ہوتی۔ اس سے کھل کر اپنے دل کی بات کہہ دو۔ بلکہ باہر کسی جگہ ملاقات کرنے کی ضد کرو۔ ضد کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"وہ ناراض تو نہیں ہوگی؟"

"ہوگی تو میں اسے سمجھا دوں گی۔"

"کیا وہ کہیں باہر جانے کے لئے تیار ہو جائے گی؟"

"وہ بہت سیدھی اور شرمیلی ہے تمہارے منہ پر کبھی راضی نہیں ہوگی۔ پہلے تم محبت کی باتیں کرو۔ بعد میں' میں باہر ملنے والا معاملہ ٹھیک کر دوں گی۔"

"میں باتیں کیسے کر سکتا ہوں؟ یہاں تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔"

"تم کل اسی وقت شام کو آنا۔ میں بھولی کو یہاں بٹھا کر رکھوں گی یہاں اور کوئی نہیں ہوگا۔ میں تم دونوں کو تنہا چھوڑ کر کسی کام کے بہانے چلی جاؤں گی۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ میں کتنے دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تمہارے ذریعے بھولی سے ملنے کی صورت پیدا کروں گا مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔"

"میں کسی کے ایسے معاملے میں نہیں پڑتی مگر تمہاری بات اور ہے۔ اچھا اب تم جاؤ۔ کل شام کو آنا۔ میں اب تھانیدار کے پاس جاؤں گی۔"

وہ رخصت ہو کر کمرے سے باہر آیا۔ آنگن سے گزرتے وقت جانے کیوں اوصاف بیگم اسے اچھی نہیں لگی' حالانکہ وہ اس کے بہت کام آنے والی تھی۔ اس کے باوجود اس

عورت سے ایسی گھن آرہی تھی جسے وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔ اس کے علاوہ تھانیدار پر اسے غصہ آرہا تھا وہ غصے اور نفرت کی وجہ نہیں سمجھ پارہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایسے پاکیزہ ماحول میں پرورش پارہا تھا' جہاں ناجائز رشتوں کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے لیکن اوصاف بیگم کا حلیہ کچھ ایسا تھا کہ وہ مکان سے باہر آکر اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچنے پر مجبور ہورہا تھا۔ اس عورت کے ساتھ ایسی کوئی بات تھی جو منصور کو کھٹک رہی تھی۔

اس نے طے کرلیا کہ بھولی سے رازونیاز کی باتیں شروع ہوتے ہی وہ اسے اوصاف بیگم سے محتاط رہنے کی تاکید کرے گا بلکہ اسے سمجھائے گا۔

وہ چلتے چلتے نہر کے پل پر رک گیا۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ کنپٹیاں گرم ہوگئیں۔ وہاں اوصاف بیگم کے پاس یہ نکتہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ پل کی ریلنگ کو تھام کر تھر تھر کانپنے لگا اور دل ہی دل میں توبہ توبہ کرنے لگا۔ ایک بھولی تھی جس کے سر سے آنچل نہیں ڈھلکتا تھا' ایک وہ اوصاف بیگم تھی جسے اپنے لباس کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ وہ دعا مانگنے لگا۔ "اے عزتوں کے رکھوالے! اے خداوند کریم!......... ہم سب کی دعا ہے کہ اس اسلامی حکومت میں آنچلوں کی لاج رہے۔ ہمارے ملک کی کسی بھولی کے سر سے آنچل نہ ڈھلکے کیونکہ ماؤں اور بیٹیوں کے سر ننگے ہوں تو پوری قوم کچھ ننگی سی نظر آتی ہے۔"

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے گھر کی طرف جانے لگا۔

☆------☆------☆

اگر بھولی نہ ہوتی تو وہ اوصاف بیگم کے دروازے پر تھوکنے بھی نہ جاتا لیکن اس سے ملاقات کی تمنا اسے کشاں کشاں وہاں تک لے گئی۔ اوصاف بیگم نے میدان صاف رکھا تھا۔ بھولی کمرے میں بیٹھی باتیں کررہی تھی منصور کو دیکھتے ہی اٹھ کر جانا چاہتی تھی۔ اوصاف بیگم نے کہا۔ "بیٹھو' ابھی تم سے بہت باتیں کرنی ہیں' میں چائے بنا کر لاتی ہوں' جب تک تم منصور سے باتیں کرو۔"

وہ دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ بھولی سمٹنے کے انداز میں دوپٹہ سنبھال

رہی تھی منصور نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ کیا میری موجودگی پسند نہیں ہے؟"

وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "گھر میں اور کوئی نہ ہو تو مجھے کسی کے ساتھ بھی باتیں کرتے ہوئے الجھن سی ہوتی ہے۔"

"تمہاری یہ احتیاط اور شرافت مجھے پسند ہے۔ میں نے ایک شریف گھرانے میں آنکھ کھولی ہے۔ میں تمہاری جیسی شریف لڑکی سے وہ۔ وہ کرتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ محبت کرتا ہوں۔"

"آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میری ایک بات مان لیں۔"

"میں تمہاری ہزار باتیں مانوں گا۔"

وہ بولی۔ "میں پہلے ہی دن دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ آپ بھولے ہیں۔ پھر پتہ چلتا گیا کہ واقعی بھولے ہیں۔ جو دیکھتے ہیں' اسے سمجھ نہیں پاتے۔ میں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ ایسی جگہ نہ آیا کریں۔"

منصور نے خوش ہوکر کہا۔ "یہ تو تم میرے منہ کی بات کہہ رہی ہو۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔"

"آپ میری بات چھوڑیں میں بے بے کی پڑوسن ہوں۔ پروین اور نورین ملک سے باہر جانے والی ہیں' وہ یہاں نہیں رہیں گی۔ تو میرا آنا جانا بھی کم ہوجائے گا۔"

"کیا وہ دونوں ملک سے باہر جارہی ہیں؟"

"جی ہاں' سنا ہے کہ لڑکیاں کم عمر ہوں اور خوبصورت ہوں تو باہر جلدی ملازمت مل جاتی ہے اسی لئے پروین سے پہلے نورین کی ملازمت پکی ہوگئی ہے۔ نورین زیادہ خوبصورت ہے نا؟"

"میری نظر میں تم سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہے۔"

اس نے اپنی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "سنا ہے آپ بھی باہر جانے والے ہیں؟"

"امی کہتی ہیں باہر نہیں جانا چاہئے' اپنے ملک میں سب کچھ ہے۔"

"ہاں، مگر عزت نہیں ہے۔ عزت اسے ملتی ہے جس کے پاس کلر ٹی وی، کپڑا دھونے کی مشین، جو سر، قیمتی صوفے اور قالین ہوں اور یہ سب کچھ باہر جاکر کمانے سے ملتا ہے۔"

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں باہر جاؤں؟"

"یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے۔ میری شادی ہو چکی ہوتی تو میں بیوی کی حیثیت سے سوچتی۔ میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں، اسی حیثیت سے سوچتی ہوں۔ جب میرے ابو ریلوے ورکشاپ میں فورمین تھے تو ہماری بڑی عزت تھی۔ ہم بنگلے میں رہتے تھے۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرتے تھے۔ چالیس برس کی ملازمت کے بعد وہ ریٹائر ہوگئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہیں تیس ہزار روپے ملے۔ پہلے میری بہن کے لئے کہیں سے رشتہ نہیں آتا تھا۔ اتنی بڑی رقم ملتے ہی رشتے آنے لگے۔ آخر ایک جگہ شادی ہوئی تو جہیز میں اٹھارہ ہزار روپے اٹھ گئے۔ شادی کے ہنگاموں کے دوران میرا بھائی دس ہزار روپے چرا کر گھر سے بھاگ گیا۔ دو برس ہوگئے واپس نہیں آیا۔ ہم باپ بیٹی کبھی فاقے کرنے لگے۔ کبھی روکھی سوکھی سے گزارہ کرنے لگے۔ ابو ریلوے میں بڑے افسر رہ چکے تھے۔ پہلے انہیں بازار میں مزدوری کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ انہوں نے ایک ٹھیکیدار کے ہاں منشی کا کام کیا مگر مہنگائی نے مار ڈالا۔ پھر میری شادی کی فکر بھی مار رہی تھی۔ انہوں نے نوکری چھوڑ دی۔ آج کل ریڑھے پر سبزیاں بیچتے ہیں۔ پہلے میں بنگلے میں رہنے والے فورمین کی صاحبزادی تھی، اب سبزی والے کی بیٹی کہلاتی ہوں۔ ہماری عزت آسمان سے زمین پر کیسے گر پڑی، یہ ہم ہی سمجھتے ہیں حالانکہ سبزیاں بیچنا نیچ کام نہیں ہے لیکن باہر کے ملکوں میں بڑے لوگوں کی جھوٹی پلیٹیں مانجھنے سے اب ہمارے معاشرے میں زیادہ عزت ملتی ہے کیونکہ کمائی زیادہ ہوتی ہے اور نمائشی برتری کا سامان خریدا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم باہر کی کرنسی سے اپنے ملک میں عزت خریدتے ہیں۔"

اس کی بات جوتے کی طرح لگی لیکن عزت کو حاصل کرنا ہی پڑتا ہے خواہ کسی راستے سے یہ ملے۔ منصور ڈگمگا گیا۔ امی کہتی تھیں کہ باہر نہ جاؤ۔ بھولی کی تلخ باتیں سمجھا رہی تھیں کہ عزت باہر ہی سے امپورٹ ہوتی ہے۔ وہ اپنے ابو کے گمشدہ بنگلے اور فرسٹ

کلاس کمپارٹمنٹ کے خواب دیکھ رہی تھی۔ زیادہ کمانے کا جو رجحان پیدا ہوگیا ہے، اسے برا سمجھتی تھی لیکن جو چیز گم ہو جاتی ہے اس کی تلاش جاری رہتی ہے اور اس کے فورمین ابو کی عزت اسی معاشرے میں کہیں گم ہوگئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اوصاف بیگم چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پینے کے دوران ان کے درمیان رسمی گفتگو جاری رہی اوصاف بیگم نے پھر انہیں تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بھولی چائے پینے کے بعد چلی گئی۔ منصور نے کہا۔ "باجی! بھولی بہت اچھی باتیں کرتی ہے مگر باتوں سے جی نہیں بھرا۔ تم کل بھی اسی وقت مہربانی کرو تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔"

"تم دونوں کو یہاں.......... آکر نہیں ملنا چاہئے یہ جگہ اچھی نہیں۔"

اس کے لہجے میں طنز تھا۔ منصور نے چونک کر پوچھا۔ "جی، یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

اوصاف بیگم نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "کوئی بات نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ یہ جگہ ملنے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ کبھی اعظم اور کبھی آصف وغیرہ شام کو اچانک یہاں آئیں گے اور تمہیں بھولی کے ساتھ دیکھیں گے تو میری بدنامی ہوگی کہ میں یہاں بیٹھ کر دلالی کرتی ہوں۔"

"توبہ، توبہ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تم نہ سوچو۔ دوسرے ضرور سوچیں گے۔"

"باجی! ملنے کی کوئی صورت ہونی چاہئے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"میں کوئی صورت نکالوں گی۔"

"مگر کب نکالو گی؟"

"تم تو پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ اب ایسی بھی جلد بازی کیا ہے؟"

"میں دل سے مجبور ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ امی کو اس کے ہاں بھیج کر فوراً ہی شادی کی بات طے کرادوں۔ پھر سوچتا ہوں، پہلے مجھے خود کمانا چاہئے۔ انشاء اللہ میں بہت جلد انجینئرنگ کا ڈپلوما لے کر سعودی عرب جاؤں گا۔"

"دانش مندی یہی ہے کہ پہلے تم خود کمانا شروع کرو۔ بھولی بہت اونچے اونچے خواب دیکھتی ہے۔"

"میں اس کے خوابوں کی تعبیر پیش کروں گا۔ فی الحال تم پھر ہماری ملاقات کراسکتی ہو؟"

"اچھی بات ہے میں اسے قائل کرنے کی کوشش کروں گی کہ وہ تمہیں کہیں باہر ملے۔ یہ جگہ مناسب نہیں ہے میں کل تمہیں بتاؤں گی۔"

اسے اطمینان ہوگیا کہ اوصاف بیگم اس کے کام آئے گی۔ اگرچہ وہ ناپسندیدہ عورت تھی۔ بھولی نے منصور سے کہا تھا کہ وہ وہاں نہ جایا کرے اور منصور بھولی کو وہاں جانے سے منع کرچکا تھا یعنی اوصاف بیگم اچھی نہیں تھی وہ اسے پسند کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے محتاج تھے' اس کے بغیر دونوں کا ملاپ ممکن نہیں تھا۔

وہ دوسرے دن اوصاف بیگم کے ہاں پہنچا تو بڑا بے چین تھا۔ وہاں تاش کی بازی جمی ہوئی تھی۔ بھولی سے باتیں ہوئیں مگر دل کی باتیں دل میں رہیں کیونکہ وہاں جاوید' آصف اور اعظم موجود تھے۔ نورین کو ملک سے باہر جانے پر مبارکباد دے رہے تھے وہ ایک ہفتہ بعد دوسال کے لئے جانے والی تھی۔

آنگن کے دوسری طرف والے کمرے میں ریکروٹنگ ایجنٹ بیٹھا ہوا تھا۔ اوصاف بیگم اور شرافت لطیفی اس کی خوب خاطرمدارات کررہے تھے۔ نورین خوب سجی بنی ہوئی لڑکے لڑکیوں سے ذرا الگ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر قیمتی لباس اور جگمگاتے ہوئے زیورات تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت اونچی بہت بڑی دکان کے شوکیس میں بیٹی ہو۔

ایک بجے کھانے کے وقت اوصاف بیگم نے نورین کو بلایا۔ وہ اپنے لباس پر خوشبو اسپرے کرنے کے بعد آنگن کو عبور کرتے ہوئے ایجنٹ کے کمرے میں چلی گئی۔ منصور کو اپنی پڑی تھی۔ وہ ڈوبتے ہوئے دل سے سوچ رہا تھا کہ آج اس کا کام نہیں بنے گا۔ اوصاف بیگم اپنا اور بیٹی کا مستقبل سنوارنے میں لگی ہوئی ہے۔ تین بجے سے پہلے حسب معمول تمام لڑکے جانے لگے۔ منصور کو بھی جانا پڑا۔ کیونکہ اوصاف بیگم اس وقت بھی

اپنے کمرے میں ایجنٹ اور نورین کے ساتھ بیٹھی باتوں میں مصروف تھی اور بھولی اپنے گھر جاچکی تھی۔

ایک دن اور گزر گیا۔ وہ صبح نو بجے پھر اوصاف بیگم کے ہاں پہنچا۔ اس وقت پروین اور آصف بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ نورین ایک رسالہ پڑھ رہی تھی۔ بھولی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اوصاف بیگم کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے سوچا کہ اس عورت کو آواز دے یا نہ دے؟ پتہ نہیں دروازہ کھلے گا تو اور کس کی صورت نظر آئے گی۔

دروازہ خود ہی کھل گیا۔ اوصاف بیگم کے پیچھے شرافت لطیفی نظر آیا۔ وہ باہر جارہا تھا۔ اوصاف بیگم نے کہا۔ "منصور! اس کمرے میں آجاؤ۔ تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ کمرے میں آیا تو وہ مسکراتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ "مٹھائی کھلاؤ' بھولی تم سے کہیں باہر ملنے کے لئے راضی ہوگئی ہے۔"

وہ خوشی سے کھل گیا۔ "کہاں ہے بھولی؟"

"لو تم ابھی سے ملنے کے لئے پوچھ رہے ہو۔ آج اس کے ابو گھر میں ہیں' وہ نہیں آئے گی۔"

وہ ذرا مرجھا گیا۔ "تو پھر وہ کب ملے گی؟ کہاں ملے گی؟"

"آرام سے بیٹھو' میں......... بتارہی ہوں۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اوصاف بیگم دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "کوئی سن نہ لے' اس لئے دروازہ لگارہی ہوں۔"

وہ دروازہ بند کرکے منصور کے پاس آئی اور اسی صوفے پر اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔

وہ گھبرا کر ایک طرف کھسک گیا۔ اوصاف بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بڑے بھولے ہو۔ میری اور بھولی کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہے۔"

منصور کو بڑا غصہ آیا۔ بھولی اٹھارہ یا انیس برس کی ہوگی' اور اوصاف بیگم پینتالیس برس سے کم نہیں ہوگی۔ کمبخت کو کمسن کہلانے کا جنون تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر

دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم بھولی سے ملانے کی بات کہہ رہی تھیں۔"

"ہاں تمہارے لئے خوشخبری ہے۔ بھولی آج رات اپنے کسی عزیز کے ہاں شادی میں جائے گی۔"

"تو اس میں خوشخبری والی کون سی بات ہے؟"

"ہے نا۔ وہ شادی میں جانے کے بہانے تم سے ملنے آجائے گی۔"

"اوہ سمجھ گیا۔" وہ خوشی سے صوفے پر پہلو بدلنے لگا۔

وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔ "تم تمام رات ملاقات کرسکتے ہو صبح وہ گھر آجائے گی۔"

منصور کا دل دھڑک دھڑک کر سینے کی دیوار سے ٹکرانے لگا۔ وہ شادی سے پہلے ایسی ملاقات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک خیال آیا کہ بھولی بالکل ہی بھولی نہیں ہے' اسے بوڑھے باپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہئے۔ پھر دل نے مبارک باد دی کہ وہ اس کے عشق میں ایسا قدم اٹھا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہماری محبوبہ ہمارے لئے اپنے پیدا کرنے والے باپ کو بھی الو بنا کر ملنے آجاتی ہے' ایسے وقت میں اخلاقی تقاضے یاد نہیں رہتے اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ "آج رات کو؟ مگر کہاں؟"

اوصاف بیگم نے پوچھا۔ "یہ تم بتاؤ۔ تمہارے پاس کہیں رات گزارنے کی جگہ ہے؟"

"آں۔ نہیں۔ میں نے کبھی اپنے گھر سے باہر رات نہیں گزاری۔"

"کیا تمہاری کوٹھی میں تمہارا کمرہ سب سے الگ ہے؟"

"ہاں۔ بالکل سامنے والا کمرہ میرا ہے۔"

"تمہارے گھر والے کب تک سوجاتے ہیں؟"

"دس گیارہ بجے تک مگر یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اگر میں بارہ بجے تک اسے چپکے سے تمہارے کمرے میں پہنچا دوں تو.........."

وہ گھبرا کر بولا۔ "نن۔ نہیں۔ وہ میرا گھر ہے۔ بھائی جان کا' اور امی ابو کا گھر ہے۔ بھولی وہاں بہو بن کر ہی قدم رکھ سکتی ہے۔"

"بہو بعد میں بن جائے گی۔ فرق کیا پڑتا ہے؟"

"نہیں باجی!" وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔ "اس گھر میں ہم بچوں نے کبھی کسی سے جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی اپنے بزرگوں کی لاعلمی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جو اس گھرانے کی بدنامی کا باعث بنے۔"

اوصاف بیگم جھلا کر بولی۔ "ایسے ہی شریف ہو تو عشق کیوں کر رہے ہو؟ ایک تسبیح لے کر بیٹھ جاؤ۔ کیا میرا گھرانا کسبیوں کا ہے کہ میں تمہارے لئے دلالی کر رہی ہوں۔"

منصور جلدی سے پاس آکر بولا۔ "تم تو ناراض ہوگئیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہارا گھرانا کسی سے کمتر ہے۔"

"کمتر اور برتر کچھ نہیں منصور! یہ یاد رکھو کہ لڑکی اور لڑکا دونوں اپنے گھر والوں کی لاعلمی میں ملاقات کرتے ہیں اور ان کے درمیان مجھ جیسی عورت خلافِ تہذیب انہیں ملنے کے مواقع فراہم کرتی ہے تو ہم تینوں کی شرافت میں کھوٹ ضرور ہے لہٰذا ہم میں سے کوئی کمتر یا برتر نہیں ہے۔ اپنے گھرانے کی شرافت کو وہیں تک محدود رکھو۔ یہاں ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

منصور کی گردن جھک گئی۔ اسی لمحے احساس ہوا کہ بھولی کی محبت میں وہ اپنی خاندانی عزت اور وقار کی سطح سے گرتا ہوا.......... اوصاف بیگم کے برابر پہنچ کر کھڑا ہوگیا ہے اور وہاں کھڑے رہ کر ایک مکمل مہذب خاندان کا فرد ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس لمحے ارادہ ہوا کہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر بھاگے اور اپنی امی کے سائے میں اتنی دور تک پناہ لے کہ اوصاف بیگم کی آواز بھی اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکے لیکن اسی لمحے نگاہوں کے سامنے بھولی کا سراپا انگڑائی لینے لگا۔ دل کہنے لگا کہ وہ انگڑائی میرے لئے ہے۔ اگر ملاقات کا یہ موقع گنوا دیا تو بھولی پھر نہیں ملے گی۔

وہ اضطراب میں مبتلا ہوگیا تھا۔ "باجی! ملنے کی کوئی جگہ میرے پاس نہیں ہے اور یہ حوصلہ بھی نہیں ہے کہ بھولی کو اپنے گھر بلاؤں۔ اگر ابو اور امی نے دیکھ لیا تو میں ندامت سے انہیں منہ نہیں دکھا سکوں گا۔ بھولی پھر اس گھر کی بہو نہیں بن سکے گی۔ میں اسے ساری زندگی کے لئے اپنانا چاہتا ہوں۔ تم ہی میرے لئے کچھ کرو۔"

"اتنا کیا ہے۔ کیا یہ کم ہے؟ ابھی شام تک کافی وقت ہے۔ ابھی سے جا کر کوئی محفوظ جگہ تلاش کرو۔ ڈھونڈنے سے کیا نہیں ملتا؟ عشق میں حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ جانے کے لئے اٹھ گیا۔ اوصاف بیگم اسے آنگن کے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اس روز وہ نوجوانوں کی محفل میں شریک نہیں ہوا۔ کوئی جگہ تلاش کرنے کے لئے نکل پڑا۔ پہلے وہ اپنے گھر گیا۔ جس گھر میں وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا' وہاں اس نے اپنے والدین سے کہا۔ "گوجرانوالہ میں میرے ایک کلاس فیلو کی شادی ہے میں وہاں جا رہا ہوں۔ کل صبح واپس آجاؤں گا۔"

والدین سے ذرا سوال وجواب کے بعد اجازت مل گئی۔ اس نے اپنے بیگ میں ایک جوڑا لباس' ٹارچ لائٹ اور احتیاطاً ایک چاقو رکھا۔ دو سو روپے لئے' پھر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ راستہ چلتے ہوئے سوچتا رہا کہ کہاں جائے۔ جب سے اسلامی نظام قائم ہو رہا تھا' نائٹ کلب بند کردیئے گئے تھے۔ ہوٹلوں کے رہائشی کمروں پر اچانک چھاپے مارے جاتے تھے اور عیاشوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا جاتا تھا۔ گناہگاروں پر ایسی دہشت طاری تھی کہ اب عیاشی کے لئے کوئی جگہ کرائے پر نہیں ملتی تھی۔

وہ دوپہر کا کھانا گھر سے کھا کر نکلا تھا۔ شام تک ایک پارک میں بیٹھا سوچتا رہ گیا کہ جگہ کہاں ملے گی؟ کئی بار اپنے گھر کا خیال آیا پہلے تو حوصلہ نہیں تھا' اب وہ گوجرانوالہ جانے کی بات کہہ کر آیا تھا۔ کل صبح سے پہلے واپس نہیں جاسکتا تھا۔ کسی دوست سے مدد چاہنے کے لئے اپنے عشق کا راز نہیں کھول سکتا تھا اور یہ تو کبھی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کسی کے ہاں بھولی کے ساتھ ایک رات گزارنا ہے۔ یہ صریحاً بے حیائی اور گناہ گاری کی بات ہوتی۔

وہ تھک ہار کر شام کے چھ بجے اوصاف بیگم کے پاس گیا۔ آنگن میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اوصاف بیگم' پروین' نورین اور شرافت لطیفی بیٹھے ہوئے تھے۔ منصور چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ سب کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف نہیں کرسکتا تھا۔ اوصاف بیگم نے خود ہی کہا۔ "تمہارے چہرے پر بارہ بج رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جگہ نہیں مل سکی۔"

منصور نے ہاں کے انداز میں خاموشی سے سر ہلایا۔ اسے سب کے سامنے شرم آرہی تھی مگر اوصاف بیگم نے ڈھٹائی سے کہا۔ "وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ تمہاری شرافت نے تمہیں بزدل بنادیا ہے۔ پروا نہ کرو' میں نے انتظام کرلیا ہے آج بھولی سے تمہاری ملاقات ضرور ہوگی۔"

منصور ایک دم سے شرما کر گھبرا گیا اور دوسروں کو دیکھنے لگا۔ نورین نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بے بے! منصور کو دیکھو' کیسے لڑکیوں کی طرح جھینپ رہے ہیں۔"

پروین نے کہا۔ "یہ حضرت ہمیں نادان بچیاں سمجھ رہے ہیں۔ ارے منصور! ہم سے کسی کے جائز ناجائز تعلقات چھپے نہیں رہتے۔"

وہ شرم سے پانی پانی ہو کر سوچ رہا تھا۔ یہ کیسا گھرانا ہے؟ جوان لڑکیاں' ماں باپ کے سامنے جائز ناجائز تعلقات کی باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی ماں کھل کر کہہ رہی ہے کہ اس نے بھولی سے ملانے کا انتظام کر دیا ہے اور باپ سامنے بیٹھا بڑی فراخدلی سے مسکرا رہا ہے جیسے یہ سب روزمرہ کی بے حیائی ہو۔

وہ رومال نکال کر اپنے چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھنے لگا۔ شرافت لطیفی نے کھانسنے کے بعد کہا۔ "میاں صاحبزادے! پسینے کو نہیں شرم کو پونچھ کر جیب میں رکھ لو۔ ہمارے خاندان میں سارے رشتے دار آپس میں بے تکلف دوست بن کر رہتے ہیں۔ اب تم بھی ہمارے اپنے ہو' بے تکلفی سے باتیں کرو۔"

اوصاف بیگم نے کہا۔ "ادھر مغلپورہ میں میری ایک بہن کا گھر ہے وہاں سارا بندوبست ہو چکا ہے۔"

منصور نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "اگر وہاں کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"تو تمہارا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔ ساری عمر کنوارے بیٹھے رہو گے۔" پروین نے کہا اور سب قہقہے لگانے لگے۔

"میاں صاحبزادے! شرم کرو۔ لڑکیاں تمہاری بزدلی پر ہنس رہی ہیں۔ اگر حوصلہ نہیں ہے تو صاف کہہ دو۔ دراصل یہ بھولی کی حماقت ہے کہ تم پر مرمٹی ہے۔" شرافت لطیفی نے کہا۔

اوصاف بیگم نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ ختم کردیا جائے ہم کیوں مفت کی درد سری مول لیں۔ منصور! جاؤ اپنے گھر میں آرام کرو۔"

بھولی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آتے آتے چھوٹ رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "میں حوصلہ کروں گا۔ تم جیسا کہو گی' ویسا ہی کروں گا۔"

"تو پھر سنو!" اوصاف بیگم بولی۔ "بھولی شادی والے گھر جاچکی ہے اس کا باپ اسے وہاں چھوڑنے گیا ہے' ابھی واپس آجائے گا۔ پروین یہاں سے نو بجے بھولی کے پاس جائے گی اور اسے شادی والے گھر سے لے کر مغل پورے میری بہن کے ہاں پہنچادے گی۔"

منصور نے پوچھا۔ "وہاں بھولی کا کوئی رشتہ دار اسے روکے گا نہیں؟"

"وہاں شادی کے گھر میں رشتے داروں کی اتنی بھیڑ ہے کہ کوئی اس کی گمشدگی کو محسوس بھی نہیں کرے گا۔ اگر کوئی خاص رشتے دار اس پر توجہ دے گا تو وہ کسی بیماری کا بہانہ کرکے وہاں سے چلی آئے گی۔ ہم نے ساری باتیں پہلے ہی سوچ لی ہیں۔ تم فکر نہ کرو میں دس بجے تمہیں یہاں سے اپنی بہن کے ہاں لے جاؤں گی اب غسل خانے سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ ہم کھانے بیٹھ رہے ہیں۔"

وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ اس کی حالت عجیب سی تھی۔ بھولی سے ملنے کی خوشی تھی۔ محبت کا جذبہ تھا۔ پکڑے جانے کا خوف اور رسوائی کا ڈر تھا۔ پھر اندر ہی اندر یہ الجھن سی تھی کہ وہ ایک ننگے خاندان میں آپھنسا ہے۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ ماں باپ اور بیٹیاں چکلے سے بھگائے جانے کے بعد شریفوں کے محلے میں آکر آباد ہوگئے ہیں۔ منصور ان کی اصلیت کو رفتہ رفتہ اس وقت سمجھ رہا تھا۔ جب تین گھنٹے بعد بھولی ملنے والی تھی۔ اس لڑکی نے اس کے قدموں کو ایسے جکڑ رکھا تھا کہ وہ اس بے حیا ماحول سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔

رات کے دس بجے وہ اوصاف بیگم کے ساتھ مغلپورہ کے ایک مکان میں پہنچا۔ وہ بھی ایک بڑے آنگن والا مکان تھا۔ وہاں اوصاف بیگم کی طرح ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک خسرا اور تین لڑکیاں تھیں' جن میں دو جوان تھیں اور تیسری جوان ہونا چاہتی تھی۔ ایک لڑکی بغیر آستین کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ غائب تھا۔ دوسری لڑکی آنگن میں

بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹے ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔

منصور وہاں پہنچ کر اور زیادہ الجھنے لگا۔ اسے یاد نہیں کہ اوصاف بیگم نے کس طرح اس کا تعارف اس مکان والوں سے کرایا۔ وہ بھولی کی فکر میں تھا کہ اس ماحول میں وہ بھی آپھنسی ہوگی۔ اس عورت نے کہا۔ "اوصاف! تمہارا یہ جوان اپنی والی کے لئے بڑا بے چین لگ رہا ہے' اسے لڑکی کے پاس بھیج دو۔"

اوصاف بیگم نے پوچھا۔ "بھولی کو کون سا کمرہ دیا ہے؟"

"وہ آخری والا' سب سے الگ تھلگ' کوئی ادھر نہیں جائے گا اور نہ ان کی باتیں سنے گا۔"

اوصاف بیگم منصور کو ادھر لے جاتے ہوئے بولی۔ "صبح ہونے سے پہلے پروین اپنے باپ کے ساتھ ایک ٹیکسی میں آئے گی اور بھولی کو شادی والے گھر میں پہنچادے گی اس کے بعد تم بھی چلے جانا۔ اب میں واپس جارہی ہوں ارے ہاں یاد آیا تمہارے پاس کچھ روپے ہوں گے۔ یہ میری بہن بڑی چھچھوری ہے۔ اسے کچھ دینا ہوگا۔"

ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر منصور نے سو کا ایک نوٹ نکال کر اسے دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے نوٹ لے کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے کو کھولا۔ کمرے کے اندر رہائشی ضرورت کا معمولی سامان تھا۔ ایک پرانے پلنگ پر صاف چادر بچھی ہوئی تھی۔ سرہانے ایک تپائی پر مٹھائی کی پلیٹ' دودھ سے بھرا ہوا شیشے کا جگ اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ بھولی کسی شادی میں شریک ہونے کے لئے بھڑکیلا لباس پہن کر آئی تھی۔ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی' دروازے پر آہٹ ہوتے ہی اس نے سر کے آنچل کو اور کھینچ کر گھونگھٹ بنالیا۔

اس نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ وہاں سہاگ کے کمرے کا ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ منصور ایسا نادان نہیں تھا کہ اس ماحول کو نہ سمجھتا۔ وہ سمجھ رہا تھا لیکن اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جس بھولی کو وہ پیار سے حاصل کرنا چاہتا تھا' وہی اس پُراسرار ماحول میں حاصل ہورہی ہے۔

وہ قریب آکر پلنگ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ گئی۔ منصور نے تھوک نگلتے

ہوئے' حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "بھو بھولی! یہ۔ یہ سب کیا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں پہلے تمہارا دل جیتنا چاہتا تھا۔ پھر تمہیں موقع دینا چاہتا تھا کہ میری اچھائی اور برائی کو سمجھو۔ اس کے بعد تمہیں دلہن بنا کے گھر لے جانا چاہتا تھا مگر یہ ہم کس عجیب ماحول میں آکر مل رہے ہیں۔ یہاں گناہ تو ہو سکتا ہے مگر محبت اور خدا کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی۔"

یک بیک اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ وہ رو رہی تھی سسک رہی تھی۔ منصور نے اس کے آنچل کو گھونگھٹ کی طرح اٹھا کر اسے دیکھا' پھر پوچھا۔ "کیا ہوا بھولی؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا مجبور ہو کر ملنے آئی ہو؟"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں آپ بہت اچھے ہیں۔ انسان نہیں' فرشتہ ہیں۔ مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا لیجئے مجھے اپنی عزت بنا کر لے چلیے میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

یہ کہتے ہوئے اور ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے وہ اس کی آغوش میں گر گئی۔ اس کا آنچل سر پر سے ڈھلکتا ہوا' بلندی سے پستی کی طرف پھسلتا ہوا منصور کے قدموں میں پہنچ کر تھم گیا۔

☆------☆------☆

آدھی رات گزر چکی تھی۔ منظور حسین صاحب میز پر جھکے ہوئے اپنے بیٹے جمیل کو خط لکھ رہے تھے۔ ان کی بیگم نے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "جب بھی بیٹے کا خط آتا ہے آپ جواب لکھنے میں شام سے صبح کر دیتے ہیں' بس اب سو بھی جائیں۔ باقی خط کل بھی لکھا جا سکتا ہے۔"

انہوں نے عینک کو ناک پر درست کرتے ہوئے کہا۔ "محبت باقی نہیں رکھی جاتی بیگم! ماں کی چھاتی میں جتنا دودھ آتا ہے' وہ سب کا سب بچے کو پلا دینا چاہتی ہے میرے قلم کی روانی میں جتنا پیار بہہ رہا ہے میں وہ سارے کا سارا بہا دینا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں صبح تک ہماری عمر وفا کرے نہ کرے۔ ہمیں کچھ باقی نہیں چھوڑنا چاہئے۔"

"آپ ایسی بات نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو ہم اپنے بیٹوں کا سہرا دیکھنے کے لئے سلامت رہیں گے۔"

"منصور تو گوجرانوالہ میں اپنے دوست کا سہرا دیکھ رہا ہو گا اور بڑے صاحبزادے سعودی عرب میں ہیں' اسے تو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔"

"آجائے گی۔ ماشاء اللہ ہمارے بچے نیک اور سعادت مند ہیں ایسی ہی بہوئیں بھی ڈھونڈ کر لائیں گے۔"

اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ بیگم نے حیرانی سے کہا۔ "اتنی رات کو ہمارے ہاں کون آسکتا ہے؟"

منظور حسن اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "ہو سکتا ہے منصور کسی وجہ سے جلدی واپس آگیا ہو۔"

بیگم بستر سے اٹھ گئیں۔ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔

"پہلے اطمینان کر لیجئے گا۔ چور بدمعاش بھی ہو سکتے ہیں۔"

"بھئی مجھے اتنی عقل ہے۔ تم اطمینان رکھو۔"

وہ دونوں ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے بیرونی دروازے تک آئے۔ دروازے کے شیشوں کے پار پولیس انسپکٹر حشمت بیگ دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آیا منظور حسن اور بیگم کو دماغی جھٹکا سا لگا۔ آج تک ان کے دروازے پر پولیس کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا' اور بھلا کیوں آتا۔ پولیس والے تو چور بدمعاشوں کے دروازوں پر جاتے ہیں۔

حشمت بیگ نے اپنی چھڑی کے ہینڈل کو دروازے کے شیشے پر ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"دروازہ کھولو' جلدی کرو۔"

منظور حسن نے دروازہ کھولا۔ حشمت بیگ کچھ اور جھٹکے سے اسے کھولتا ہوا اندر آیا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر منظور حسن کو گھورتے ہوئے بولا۔

"اس علاقے میں آپ کی عزت اور شرافت کی دھوم ہے۔ آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ہتھکڑیاں پہنا کر اسے لے جاتا۔ اب بھی آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ اپنے بیٹے کو قانون کے حوالے کردیں۔"

"کیا ہمارے بیٹے کو؟ مگر کیوں؟ اس کا قصور کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ کے بیٹے کا نام منصور ہے نا؟"

"جی ہاں۔ وہ آج دوپہر کو گوجرانوالہ گیا ہے۔ کل صبح........"

حشمت بیگ گرج کر بولا۔ "آپ بکواس نہ کریں۔ وہ بھولی نام کی ایک بھولی بھالی لڑکی کو بھگا کر لے گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسی گھر میں پناہ لے سکتا ہے۔"

والدین کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ جو کچھ سن رہے تھے۔ اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس لئے کہ اپنے بچوں کی پرورش اور انہیں دی ہوئی تعلیمات پر انہیں ناز تھا۔ بیگم نے اضطراری حالت میں گردن ہلاتے ہوئے نہیں نہیں کی تکرار کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں آفیسر نہیں۔ میرے بیٹے پر کسی نے جھوٹا الزام لگایا ہے۔ اگر میرا کوئی بیٹا ایسا ہوتا تو میں اس کی ماں نہ ہوتی۔"

منظور حسن نے کہا۔ "انسپکٹر! ایک باپ کی حیثیت سے میں بھی یہ تسلیم نہیں کرسکتا

کہ میری اولاد سے ایسا جرم سرزد ہوسکتا ہے لیکن آپ قانون کے محافظ ہیں۔ کسی کی یقین دہانی پر یہاں آئے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اتنا بڑا الزام کس نے لگایا ہے؟"

اس نے چھڑی کے اشارے سے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ "جاؤ ٹیکسی ڈرائیور کو رکنے کے لئے کہو اور لڑکی کے باپ کو بلا کر لے آؤ۔"

سپاہی چلا گیا۔ حشمت بیگ تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھنے لگا۔ منظور حسن نے کہا۔ "جناب! صوفہ پر بیٹھیں اپنے سپاہی کو حکم دیں کہ وہ ہمارے گھر کی تلاشی لے۔ آپ کو یقین آجانا چاہئے کہ بھولی نام کی کوئی لڑکی یہاں نہیں ہے۔"

وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "میرا نام حشمت بیگ ہے۔ میں لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لیتا ہوں۔ وہ لڑکی اس لفافہ میں میرا مطلب ہے اس گھر میں نہیں ہے آپ کا لڑکا اسے کسی دوسری جگہ لے گیا ہے۔"

پھر وہ انگڑائی لیتا ہوا بدن کی ہڈیاں چٹخاتا ہوا بولا۔ "آہ یہ پولیس کی نوکری دن بھر دوڑاتی ہے تھک کر چور ہوگیا ہوں' کچھ کھانے کے لئے ہو تو چائے کے ساتھ لے آؤ۔"

"میں ابھی لاتی ہوں۔" بیگم کچن کی طرف چلی گئیں۔

دس منٹ کے بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ وہاں ایک سپاہی تھا اور اوصاف بیگم ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ بوڑھے آدمی کی آنکھیں یوں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ مسلسل روتا رہا ہو۔ دروازہ کھلتے ہی وہ ہاتھ جوڑتا ہوا اندر آیا۔ انسپکٹر سے بولا۔ "اگر یہ منصور کے والد ہیں تو میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ان کے قدموں میں گرتا ہوں۔ خدا کے لئے میری بیٹی واپس کردیں' میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ صبح ہونے سے پہلے وہ مجھے نہ ملی تو میں کسی کو منہ دکھانے سے پہلے مرجاؤں گا۔"

منظور حسن کا دل اس کی المناک حالت سے پسیج گیا' وہ بولے۔ "جناب! آپ یہاں آکر بیٹھیں۔ عزت دینے والا خدا ہے۔ کوئی آپ کو ذلت نہیں دے سکے گا۔ آپ یہ جانیں کہ آپ کو میرے لڑکے پر شبہ کیوں ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میرے بیٹے کے خلاف آپ کو بھڑکایا گیا ہو۔"

بھولی کے باپ نے اوصاف بیگم سے کہا۔ "بہن! بھولی کی وہ کاپی دو۔ میں ثبوت دیتا

ہوں۔"

اوصاف بیگم نے پچاس صفحات والی ایک کاپی بڑھادی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "منصور کی امی کہاں ہیں۔"

"کچن میں ہیں۔"

وہ اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی۔ منظور حسن نے اس کاپی کو کھول کر دیکھا۔ اس کے صفحات پر جگہ جگہ منصور کا نام اور کوٹھی کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ جگہ جگہ مختلف انداز میں لکھا ہوا تھا کہ بھولی منصور کو دل وجان سے چاہتی ہے۔ منصور اسے دنیا والوں سے دور خوابوں کی دنیا میں لے جانا چاہتا ہے۔

بھولی کے باپ نے کہا۔ "اور وہ اسے کہیں خوابوں کی دنیا میں لے گیا ہے۔ میں نے سنا ہے منظور صاحب! کہ آپ نے اپنی ایک بیٹی بیاہی ہے۔ آپ عزت دار آدمی ہیں۔ کیا آپ میری عزت نہیں رکھیں گے؟"

منظور حسن نے کہا۔ "میں اپنی جان دے کر بھی آپ کی عزت رکھوں گا۔ مجھے تھوڑی دیر سوچنے اور سمجھنے کی مہلت دیجئے۔"

وہ مہلت حاصل کرکے سوچنے لگے۔ کچن میں اوصاف بیگم منصور کی امی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "بہن! منصور کو میں بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ روز نو بجے میرے ہاں آتا ہے اور تین بجے سہ پہر سے پہلے چلا جاتا ہے۔ بھولی بھی میرے ہاں آتی تھی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ محبت میں دیوانے ہوکر ایسی حرکت کر بیٹھیں گے۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں آپ کے پاس آکر کہتی کہ بھولی کو بہو بنا کر لے آئیں۔"

بیگم نے کہا۔ "گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو میں بہو کیسے بنا سکتی ہوں؟"

"بہن! سچ پوچھو تو تالی دونوں ہاتھوں سے بجی ہے۔ اس میں صرف بھولی کی نہیں، آپ کے بیٹے کی بھی نادانی ہے بلکہ زیادتی ہے کوئی لڑکی تنہا بھاگنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ انہیں لڑکے ورغلاتے ہیں۔ بھلے آپ اپنے بیٹے کی خطا تسلیم نہ کریں۔"

"نہیں، اگر منصور نے ایسا کیا ہے تو میں بھولی کو معصوم، اور اپنے بیٹے کو مجرم کہوں

گی لیکن یہ غلطی تسلیم کرنے کا نہیں بلکہ قانون کی گرفت سے محفوظ رہنے اور بدنامی سے بچنے کا مسئلہ ہے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کبھی تھانے کچہری کا منہ دیکھنا پڑے گا۔"

اوصاف بیگم نے کہا۔ "ہاں اولاد کی جذباتی غلطی والدین کی اور خاندان کی برسوں کی عزت خاک میں ملادیتی ہے۔"

منصور کی امی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "بہن! تم چاہو تو لڑکی کے باپ کو سمجھا سکتی ہو۔ تھانے کچہری تک بات جائے گی تو لڑکی بدنام ہوگی، اگر ذرا صبر سے کام لیا جائے تو ہم سب لڑکے لڑکی کو ڈھونڈ نکالیں گے۔"

اوصاف بیگم نے کہا۔ "میں بھی تمہیں بہن سمجھتی ہوں.......... تمہاری عزت میری عزت ہے لیکن اب یہ کیس لڑکی کے باپ کے ہاتھ سے نکل کر تھانیدار حشمت صاحب کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم یہ تھانیدار بڑا لالچی ہے موٹی رقم لے گا تب اس کیس کو دبائے گا۔ نہیں تو عدالت تک پہنچائے گا۔"

"عدالت میں جائیں ہمارے دشمن۔ میں منصور کے ابو سے کہتی ہوں وہ انسپکٹر کو دے دلا کر اس کیس کو تھانے میں اندراج کئے جانے سے روک دیں گے۔"

اوصاف بیگم نے کہا۔ "منصور کے ابو ایک شریف آدمی ہیں شریف آدمی ایک بدمعاش کو قائل کرسکتا ہے، تھانیدار کو نہیں کرسکتا۔ یہ کام میں ہی کرسکتی ہوں۔"

منصور کی امی نے خوشامد کی۔ اوصاف بیگم ڈرائنگ روم میں آئی اور انسپکٹر حشمت بیگ کو ایک طرف بلا کر کھسر پھسر کرنے لگی۔ دوسری طرف بیگم نے منظور صاحب کو بلا کر سمجھایا کہ یہ معاملہ رات کے اندھیرے میں ختم ہوجائے تو بہتر ہے۔ انسپکٹر کا منہ نوٹوں سے بھر دینا چاہئے۔

منظور حسن نے کہا۔ "آج تک میں نے کسی سے رشوت نہیں لی اور نہ ہی کسی کو رشوت دی۔ اگر بیٹا مجرم ہے تو اسے سزا ملنی چاہئے۔"

بیگم نے سہم کر کہا۔ "یہ اسلامی حکومت ہے۔ منصور کو کوڑے مارے جائیں گے، اسے سنگسار کیا جائے گا۔ کیا آپ اسے سزا پاتے دیکھ سکیں گے؟"

"نہیں دیکھ سکوں گا۔ میرے بچے کو ایک پتھر بھی لگے گا تو میں مرجاؤں گا۔ میں اسے

بچالوں گا۔ رشوت کے علاوہ دوسرا رستہ بھی ہے اور وہ یہ کہ بیٹا جسے لے گیا ہے' اسے ہم بہو بنالیں گے۔"

"آں نہیں' میں کسی شریف زادی کو بہو بناؤں گی۔"

"وہ بوڑھا جو ڈرائنگ روم میں بیٹھا رو رہا ہے' وہ ہم سے زیادہ شریف اور مظلوم ہے۔ اگر اس کی بیٹی شریف زادی نہیں ہے تو ہمارا بیٹا بھی شریف زادہ نہیں کہلاسکتا۔ گرتے ہوئے کو تھامنا اور ڈوبتے ہوئے کو کنارے لانا ہی شرافت ہے۔ آؤ ہم لڑکی کے باپ سے معاملہ طے کریں۔"

بیگم کو منظور نہیں تھا مگر وہ مجبوراً منظور حسن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئیں۔ ساتھ ہی چائے اور ناشتے کی ٹرالی لائیں وہاں اوصاف بیگم بڑی بے حیائی سے تھانیدار سے لگی بیٹھی تھی۔ تھانیدار حشمت بیگ کہہ رہا تھا۔ "میری رات کی نیند حرام ہوئی ہے پورے پانچ ہزار لوں گا تب یہ معاملہ ختم کروں گا۔"

منظور حسن نے کن انکھیوں سے حشمت بیگ کو دیکھا۔ پھر بھولی کے باپ کے پاس آکر......... بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بھائی صاحب! لڑکے لڑکی دونوں نے بڑی غلطی کی ہے اگر وہ دونوں ایک دوسرے کو اس قدر چاہتے ہیں اور آپ بھی چاہتے ہیں تو ہم ان دونوں کی شادی کردیں۔ تمام غلطیوں اور بدنامیوں پر پردہ پڑ جائے گا۔"

تھانیدار حشمت بیگ کی مونچھیں مسکرانے لگیں' وہ بولا۔ "اب لڑکے لڑکی کی پسند کا وقت گزر چکا ہے' ماں باپ کی رضامندی بھی کام نہیں آئے گی۔"

"کیوں؟" منظور حسن نے پوچھا۔

"کیونکہ بھولی کے باپ ریاست علی نے بھولی کے اغوا کی رپورٹ درج کرائی ہے' ایک تحریری بیان پر دستخط کئے ہیں۔ اگر یہ بھولی اور منصور کی شادی کے لئے کیس واپس لے گا تو اسے قانون کے سامنے جواب دینا ہوگا کہ آج تمام رات اس کی بیٹی کہاں غائب رہی تھی۔"

منظور حسن نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ریاست علی نے گڑگڑا کر التجا کی۔ "حضور! یہ بات اگر سہولت سے طے ہوجائے اور میں بدنامی سے بچ جاؤں تو آپ کا کیا

نقصان ہوگا؟"

"کیسے نہیں ہوگا؟" وہ کڑک کر بولا۔ "کیا میں تمہارے باپ کا نوکر ہوں کہ آدھی رات کے بعد یہاں اپنی نیند خراب کرکے جاگ رہا ہوں۔ یاد رکھو ابھی میں نے ایف آئی آر نہیں کاٹی ہے اگر صبح تک لڑکی واپس نہ آئی تو........."

منظور حسن نے کہا۔ "انشاء اللہ آجائے گی۔ آپ کی نیند خراب ہوئی۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ آپ چاہیں تو دو خاندانوں کو بدنامی اور پریشانی سے بچا سکتے ہیں۔ یہ معاملہ یہیں ختم ہوسکتا ہے۔"

"یہ معاملہ یہیں ختم ہوسکتا تو میں نہیں آپ تھانیدار ہوتے۔ میں قانون کا محافظ ہوں' ایک ذمہ دار افسر ہوں۔ میرے علاقے سے ایک لڑکی غائب ہو اور میں اغوا کرنے والے کی حوصلہ افزائی کے لئے معاملہ یہیں ختم کردوں' یہ نہیں ہوسکتا۔"

"کیا ہوسکتا ہے' یہ میں جانتی ہوں۔" اوصاف بیگم نے اٹھتے ہوئے بیگم سے کہا۔ "بیگم صاحبہ آپ ذرا ادھر آئیں۔"

وہ دونوں دوسرے کمرے میں گئیں' اوصاف بیگم نے کہا "وہ پانچ ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لے گا۔"

بیگم نے کہا۔ "منصور کے ابو رشوت دینے کے خلاف ہیں۔"

"تو پھر جانے دو۔ عدالت میں' اخباروں میں' گلیوں میں کوچوں میں اپنی عزت کا جنازہ اٹھتے دیکھنا........."

وہ جانے لگی۔ بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ "بہن! میں کیا کروں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اچانک ہم پر افتاد آپڑی ہے کہ عقل کام نہیں کرتی۔ بس ایک ہی بات میں جانتی ہوں کہ میرا بیٹا اسلامی تعزیرات سے محفوظ رہے۔"

اوصاف بیگم نے کہا۔ "تو پھر منصور کے ابو کو جانے دو۔ آپ چپ چاپ اس کی مطلوبہ رقم ابھی ادا کردیں۔ میں اسے باہر لے جاکر سارا معاملہ ٹھنڈا کرادوں گی۔"

بیگم تیزی سے سوچنے لگیں۔ بیٹے کی سلامتی کے لئے یہی ایک راستہ سمجھ میں آیا کہ چپ چاپ رشوت دے دی جائے۔ انہوں نے پوچھا۔ "اگر میں مطالبہ پورا کروں تو

"پھر یہ لوگ میرے بیٹے کو گرفتار نہیں کریں گے نا؟"

"بالکل نہیں۔ کوئی منصور کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس دروازے پر کبھی پولیس والے نہیں آئیں گے۔"

"اچھا۔ تم یہاں بیٹھو میں ابھی رقم لے کر آتی ہوں۔"

وہ خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں منظور حسن تھانیدار کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھے اسے دین ایمان کی باتیں سمجھا رہے تھے کہ ہم اسلامی نظام اسی وقت قائم کرسکتے ہیں' جب ہم میں سے ہر شخص فرض شناس ہو۔ ایک پولیس والے کا کام صرف مجرم کو پکڑنا ہی نہیں ہے بلکہ مجرموں کو راہ راست پر لانا بھی ہے۔ اگر غلطی سے توبہ کرلیں یا ان کے والدین انہیں رشتہء ازدواج میں منسلک کرکے آئندہ غلطیوں کے امکانات ختم کردیں تو ایک پولیس افسر کو ان سے مکمل تعاون کرنا چاہئے۔

تھانیدار حشمت بیگ سن رہا تھا اور رہ رہ کر جمائیاں لیتا جارہا تھا۔ طبی نظریات سے قطع نظر جمائیاں اظہار کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ عورت کی انگڑائیاں بلاتی ہیں' جمائیاں بھگاتی ہیں۔ خاموش ادا سے کہہ دیتی ہیں۔ "اب جاؤ نیند آرہی ہے۔" ایک گھریلو عورت ریڈیو سے بازار کا بھاؤ سن کر جمائی لیتی ہے۔ آدھی قوم بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر منہ پھاڑتی ہے۔ کافر' دین کی باتیں سن کر اور سرکاری ملازمین رشوت نہ ملنے پر جمائیاں لیتے ہیں۔ یہ جمائی بین الاقوامی زبان ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں منہ پھاڑ کر بولی جاتی ہے۔

تھانیدار کی یہ زبان بیچارے منظور حسن کی سمجھ میں نہیں آئی۔

تھوڑی دیر بعد اوصاف بیگم نے آکر کہا۔ "تھانیدار جی چلئے یہ لوگ اپنے اصول کے پابند ہیں۔ یہ اپنا انجام خود ہی بھگت لیں گے۔"

ایسا کہتے وقت اس نے آنکھ کا مخصوص اشارہ کیا۔ تھانیدار سمجھ گیا کہ کام بن گیا ہے وہ اٹھ کر اوصاف بیگم کے ساتھ باہر جانے لگا۔ بھولی کا باپ ان کے پیچھے گڑگڑاتا ہوا جارہا تھا کہ اس کی عزت بچائی جائے۔ منظور حسن خاموشی سے سر کو جھکائے بیٹھے رہے۔

جب وہ لوگ چلے گئے' ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا تو انہوں نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھا۔ بیگم نظر نہیں آئیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر شکست خوردہ

انداز میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے خواب گاہ میں پہنچے۔ بیگم نے انہیں دیکھتے ہی ایک مجرم کی طرح سر جھکالیا۔ وہ بولے۔ "اس عورت کے چہرے کا اطمینان اور تمہارا جھکا ہوا سر بتا رہا ہے کہ تم نے ان کا مطالبہ پورا کردیا ہے۔"

بیگم آنچل کی آڑ میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔ بلک بلک کر کہنے لگیں۔ "اسلام میں کوئی مجرم سزا سے نہیں بچ سکتا۔ سزائیں سخت ہیں اور بچے نادان ہیں۔ وہ عادی مجرم نہیں ہیں۔ انہوں نے جرم کو جرم سمجھ کر نہیں کیا ہے' مجرم میں ہوں کہ میں نے رشوت دی۔ مجرم وہ قانون کا محافظ ہے جو رشوت لے کر گیا ہے۔ میں جان بوجھ کر اندھی نہیں بن سکتی تھی۔ اپنے بیٹے کو سنگسار کرانے کے لئے رشوت خوروں کے حوالے نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار آپ سے پوچھے بغیر کام کیا ہے' میں سزا پانے کے لئے تیار ہوں۔"

ایسے کہنے کے دوران وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ منظور حسن آہستہ آہستہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے......... اصول ان کی سچائی اور ان کی مستقل مزاجی کمزور پڑ گئی۔ وہ ایک ماں کی ممتا سے نہیں لڑ سکتے تھے۔

وہ دونوں چپ رہے۔ اپنی اپنی جگہ سوچتے رہے کہ بیٹا اس وقت کہاں ہوگا؟ کیا وہ سچ مچ کسی لڑکی کو بھگا کر لے گیا ہے؟ یا یہ محض ایک دہشت طاری کرنے والا خواب ہے؟ وہ خود کو تسلیاں دے رہے تھے کہ صبح ہوتے ہی خواب ٹوٹ جائے گا دہشت ختم ہوجائے گی اور وہ بیٹے کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھیں گے۔

دوسری طرف منصور بھولی کے نشہ میں چور تھا۔ پروگرام کے مطابق پروین صبح پانچ بجے سے پہلے ٹیکسی لے کر آئی تھی' اور بھولی کو ساتھ لے گئی۔ منصور اپنا بیگ شانے سے لٹکا کر وقت گزارنے میکلوڈ روڈ کی طرف آیا۔ دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اس نے ایک حمام میں غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور شیو کرانے کے بعد......... انارکلی کی ایک دکان میں پوری بھاجی کا ناشتہ کیا۔ ڈٹ کر ایک گلاس لسی پی۔ پھر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ یعنی اب وہ گوجرانوالہ سے گھر واپس جارہا تھا۔

نہر کے کنارے اسے اپنی کوٹھی ویران ویران سی لگی۔ بیرونی دروازہ مقفل نہیں

تھا۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں عجیب سا سناٹا تھا۔ امی ابو نظر نہیں آرہے تھے۔ کسی دور افتادہ کمرے سے کوئی بات کوئی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ مختلف کمروں سے گزرتا ہوا خواب گاہ کے دروازے پر آکر ٹھٹک گیا۔ اس کے ابو کرسی پر بیٹھے تھے' اور میز پر جھکے سر ٹیکے ہوئے سو رہے تھے۔ امی پلنگ کے پاس قالین پر بیٹھی تھیں۔ بستر کے سرے پر ان کا سر ٹکا ہوا تھا اور وہ بھی سو رہی تھیں۔

منصور کا دل دھک سے رہ گیا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کے والد جس حالت میں رات بھر جاگتے رہے تھے اسی حالت میں اب دن کے دس بجے تک سو رہے ہیں مگر کیوں جاگ رہے تھے؟ کیا بھید کھل گیا ہے؟ لیکن کیسے کھل سکتا ہے؟ وہ محبت' وہ ملاقات بڑی رازداری سے ہوئی تھی۔ ایسا کوئی دشمن یا مخبر نہیں تھا جو اس گھر تک پہنچ سکتا۔ وہ مطمئن ہوکر خواب گاہ میں داخل ہوا۔ پھر اس نے ہولے سے آواز دی۔ "ابو۔"

وہ نیند میں کسمسائے۔ ماں نے بیٹے کی آواز نیند کی غفلت اور گہرائی میں بھی سن لی تھی۔ اس نے پھر آواز دی۔ "امی!"

انہوں نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔ دروازے پر کھڑے ہوئے بیٹے کو دیکھا تو آنکھیں سکتے کے عالم میں دیکھتی ہی رہ گئیں۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ نیند سے بیدار ہوگئی ہیں۔ اس کے ابو بھی دوسری طرف بیدار ہوگئے تھے اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "آ۔ آپ دونوں اس طرح کیوں سو گئے تھے' کیا بات ہے؟"

بیگم اور منظور حسن نے ایک دوسرے کو بولتی نظروں سے دیکھا۔ بیگم کی نظریں بول رہی تھیں۔ میرے بیٹے کے شانے سے بیگ لٹک رہا ہے۔ یہ سچ مچ کو جرانوالہ سے آرہا ہے' منظور حسن کی نظریں بول رہی تھیں۔ ایک ماں ہزار بار دھوکے کھانے کے بہانے ڈھونڈ لیتی ہے۔ میں دھوکے میں نہیں آسکتا۔ مجھے اپنے بیٹے کا نہیں' ایک جھوٹے کا چہرہ نظر آرہا ہے۔

انہوں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے؟"

منصور کے دماغ کو جھٹکا لگا۔ وہ ایک قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ "جی آپ کیا کہہ رہے

ہیں؟ کک۔ کون لڑکی؟"

"بھولی۔ ریاست علی کی بیٹی اوصاف بیگم کی پڑوسن..........."

منصور کا سر چکرا گیا۔ اس نے دروازے کا سہارا لیا۔ مارے ندامت کے اپنا منہ اپنے بازو میں چھپا لیا' اسے پہلی بار پتہ چلا کہ زمین میں گڑ جانا کسے کہتے ہیں۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ پاؤں تلے سے زمین سرک گئی ہے اور وہ شرم سے گڑ رہا ہے۔ ذرا دیر بعد اسے اپنے شانے پر امی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "بیٹے اسے بھگا کر کہاں لے گئے ہو؟ کیا یہاں لائے ہو؟"

اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ بدستور منہ چھپاتے ہوئے بولا۔ "یہ جھوٹ ہے' میں کسی کو بھگا کر نہیں لایا ہوں میں کبھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا' کسی نے آپ کے کان بھرے ہیں۔"

"کل رات لڑکی کا باپ خود یہاں پولیس والوں کے ساتھ آیا تھا۔ بیٹے ہمارے دروازے پر پولیس والے کیوں آئے جواب دو۔"

وہ کیا جواب دیتا؟ وہ بھولی کو بھگا کر نہیں لے گیا تھا' یہ سچ ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ بھولی کے ساتھ ایک رات کے لئے بھاگا ہوا تھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "امی! پولیس والے اغوا کا جھوٹا کیس بنا کر آئے تھے۔ پولیس والے جرم کرنے والے کو نہیں روک سکتے۔ ہم پولیس والوں کو مجرمانہ حرکتوں سے باز نہیں رکھ سکتے۔"

"میں ایک سوال کا جواب چاہتی ہوں' بھولی کہاں ہے؟"

"وہ اپنے گھر میں ہے۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے؟"

"جی ہاں۔"

"یعنی آنکھوں دیکھا یقین ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اس کا مطلب ہے بھولی کو قریب سے دیکھتے ہو۔ قریب سے جانتے ہو اور قریبی تعلقات ہیں؟"

وہ ہچکچاتے' شرماتے ہوئے بولا۔ "وہ بہت اچھی' بہت نیک لڑکی ہے۔ میں آپ سے اس کا ذکر کرنے والا تھا۔"

"میں ایک ہی بات جانتی ہوں۔ گھر والے جسے رات بھر تلاش کرتے رہے ہوں وہ نیک لڑکی نہیں ہو سکتی۔"

"امی نیک لوگوں سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اس کی غلطی میں' میں بھی برابر کا شریک ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہمارے اندر سے نیک جذبے ختم ہو چکے ہیں۔"

منظور حسن نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بیگم بحث نہ کرو۔ اپنے بیٹے سے کہو' ایک کاغذ پر ریاست علی کا پتہ لکھ دے۔ میں ابھی لباس تبدیل کرکے وہاں جاؤں گا اور اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا کہ بھولی وہاں موجود ہے یا نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف جانے لگے۔ جب وہ چلے گئے باتھ روم کا دروازہ بند ہوگیا تو منصور نے کہا۔ "امی! میری ایک غلطی سے آپ کو اور ابو کو جو صدمہ پہنچا ہے' اس پر میں بہت شرمندہ ہوں۔ اب ساری زندگی اس کی تلافی کے لئے کوشش کرتا رہوں گا لیکن آپ میری ایک بات مان لیں' پھر میں آپ سے زندگی بھر کچھ نہیں مانگوں گا' مجھے بھولی چاہئے۔"

بیگم نے بیٹے کی بھیک مانگنے والی صورت دیکھی۔ سر جھکا کر سوچا' پھر کہا۔ "ابھی میں وعدہ نہیں کرسکتی۔ تمہاری یہ التجا سننے کے بعد مجھ سے رہا نہ جائے گا۔ میں بھی تمہارے ابو کے ساتھ جاؤں گی۔"

منصور نے اطمینان کی سانس لی' اسے یقین تھا کہ بھولی اس کے والدین کے معیار پر پوری اترے گی۔

☆------☆------☆

بھولی کمرے کے ایک گوشے میں دیوار سے ٹیک لگائے' سر نیہوڑائے ننگے سر فرش پر بیٹی رو رہی تھی۔ اس کی حالت اس لئے قابل رحم نہیں تھی کہ وہ "بیچاری" رو رہی تھی بلکہ اس لئے تھی کہ وہ شرم سے مری جارہی تھی۔ رونا تو سب ہی کو آتا ہے۔ شرم

کسی کسی کو آتی ہے۔

ریاست علی چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں کیونکہ وہ پچھلی رات سے جاگ رہا تھا۔ حقے کے انگارے اس کے سینے کے اندر سلگ رہے تھے' ہر کش میں بھڑک رہے تھے۔ بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا کلیجہ جل رہا ہے۔ میری عزت دھواں دھواں ہو رہی ہے۔ خدا کی قسم میری آنکھیں اس وقت تک نہیں سوئیں گی' جب تک تجھے کسی کے پلے نہیں باندھ دوں گا۔"

اس کے منہ سے آہ یوں نکلی جیسے سینے سے دھواں نکل رہا ہو۔ کمرے کی خاموشی میں صرف حقے کی گڑگڑاہٹ ابھر رہی تھی۔ ریاست علی نے دور کونے میں بیٹھی بیٹی کو دیکھا۔ وہ سمٹی ہوئی اِدھر اُدھر سے اپنے بدن کو چھپائے بیٹھی تھی۔ دوپٹہ سر اور شانے سے ڈھلک کر فرش پر آگیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "اب تو تجھے دوپٹے کا بھی خیال نہیں رہتا۔ بے غیرت' باپ کے سامنے ننگے سر بیٹھی ہے۔"

وہ جلدی سے دوپٹے کو اٹھا کر گھونگھٹ کی طرح سر پر ڈالنے لگی تاکہ سر کے ساتھ منہ بھی چھپا رہے۔ "آہ! ہم اولاد کو بچپن سے سمجھاتے ہیں کہ سر ننگا نہ رکھو مگر اولاد جوان ہو کر خود کو والدین سے زیادہ عقلمند سمجھنے لگتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آنچل ایک ڈھال ہے جسے سر پر رکھنے سے لڑکیوں کی عزت محفوظ رہتی ہے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں اور سمجھانا چاہتے ہیں کہ آنچل مشرقی تہذیب کا ایک پرچم ہے جو ہماری بہو بیٹیوں کے سر پہ سجتا ہے۔ حیا کا شاعرانہ اظہار یہ ہے کہ عورت سر پر آنچل رکھ لیتی ہے۔ مختلف قومیں مختلف علامتوں سے اپنی تہذیب کو پیش کرتی ہیں۔ ہم اپنی غیرت مند تہذیب کو آنچل کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ حقہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی زبان میں بڑبڑا رہا تھا۔ "کل رات منصور کا باپ تجھے بہو بنا کر لے جانے پر راضی تھا۔ مگر اوصاف اور تھانیدار پنچ اور ہی دھندے میں لگے ہوئے تھے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہماری پڑوسن ایک غلط عورت ہے۔ جب یہ پہلی بار اپنے میاں اور لڑکیوں کے ساتھ اس محلے میں رہنے آئی تو یہاں کے لوگ دبی زبان سے کہہ رہے تھے کہ ہر شہر میں چکلے بند کر دیئے گئے ہیں۔ یہ

عورت وہاں سے اٹھ کر اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آباد ہوگئی ہے۔"

حقہ پھر گڑگڑایا۔ انگارے بھڑکے پھر وہ بولا۔ "مگر...... اوصاف ایسے اخلاص سے پیش آئی ایسی محبت سے مجھے بھائی بنایا کہ میں نے محلے والوں کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ اب پچھتا رہا ہوں کہ تجھے اس گھر دن رات جانے کی اجازت کیوں دیتا رہا۔ مگر نہیں، شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنی زبان سے کسی کی برائی نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ برے کاموں کی سزا دیتا ہے ہمیں کسی پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہئے جس کے اعمال اس کے ساتھ۔ میں ابھی کچھ اور کہہ رہا تھا۔ بھلا کیا کہہ رہا تھا؟"

ریاست علی نے حقے کا کش لگا کر سوچا پھر کہا۔ "ہاں یاد آیا وہ منصور کا باپ فرشتہ ہے۔ اس نے فوراً ہی بدنامی کا منہ بند کرنے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا مگر وہ تھانیدار مجھے پکڑ کر وہاں سے واپس لے آیا۔ میں کیا کرتا؟ اس تھانیدار کے رحم وکرم پر تھا۔ ہماری عزت اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجبوراً آنا پڑا۔ اب سوچتا ہوں اس کوٹھی میں کیسے جاؤں؟ لڑکی کا باپ ہوں۔ خاندانی عزت اور شرافت ادھر جانے سے روکتی ہے، بے غیرت بن کر جا نہیں سکتا۔ میرے مالک یہ کیسی مجبوری ہے؟"

بھولی اسی طرح کمرے کے ایک گوشے میں سمٹی سمٹائی ہوئی سسک رہی تھی۔ اس نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "حالات مجھے مجبور کرسکتے ہیں مگر بے غیرت نہیں بنا سکتے۔ اب میں تجھے اس گوشے سے اٹھنے نہیں دوں گا اور میں بھی یہاں بیٹھا رہوں گا۔ کوئی رشتہ آیا تو تجھے رخصت کردوں گا ورنہ جاگتا رہوں گا، ایک چوکیدار کی طرح پہرہ دیتا رہوں گا۔ ایک جوان بیٹی کے باپ کو بے خوابی کی موت مرنا چاہئے۔"

اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔ ریاست علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے کے باہر آکر پہلے دروازے کو بند کیا وہاں تالا لگایا تاکہ اب بیٹی پر کسی کا سایہ نہ پڑے پھر اس نے آنگن کا دروازہ کھولا۔ اوصاف بیگم کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر آتے ہوئے بولی۔ "بھیا تم غصے میں ہو میں نے سوچا میں ہی چل کر تم باپ بیٹی کو کچھ کھلا پلا دوں۔"

"اوصاف! زہر لائی ہو تو کھاؤں گا، ورنہ واپس لے جاؤ۔ کل تھانیدار کے ساتھ تمہاری بے تکلفی اور سودے بازی دیکھ کر میں بہت کچھ سمجھ گیا ہوں، اب بہتر یہ ہوگا کہ

ہمارے تعلقات بالکل ہی ختم ہوجائیں۔"

وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "جب سمجھ ہی گئے تو اور سمجھداری سے کام لو۔ بیٹی کے اغوا کے سلسلے میں تمہارا تحریری بیان تھانیدار حشمت بیگ کے پاس موجود ہے۔"

"وہ میں نے قانون کا سہارا مانگنے کے لئے ایسا کیا تھا۔"

"وہ سہارا...... وہ تمہارا بیان بدنامی کا اخبار بھی بن سکتا ہے۔ ہم سے دوستی ہے، دوستی ہی رکھو۔ اوصاف سے دشمنی مہنگی پڑے گی۔"

"اوہ!" وہ پریشان ہوکر بولا۔ "تو تم اپنی اصلیت دکھا رہی ہو۔"

"اصلیت سارا محلہ جانتا ہے کہ ہم بدنام محلے سے آئے ہیں ہمارے ہاں جوان لڑکے آتے ہیں لیکن کوئی ہم پر انگلی نہیں اٹھاسکتا۔ اللہ حشمت بیگ ایسے تھانیدار کو سلامت رکھے۔ تم ہماری اصلیت دیکھنے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکو۔ شریفوں کے گھروں میں بھی وہی ہوتا ہے جو ہمارے گھروں میں ہوتا ہے۔ شریف لوگ چھپا لیتے ہیں ہم نہیں چھپاتے، اس لئے شریف نہیں کہلاتے۔ اگر ہم میں تم میں کوئی فرق ہے تو بتاؤ؟"

ایک بدچلن عورت منہ پر تھوک دے تو کیسا لگتا ہے...... یہ ریاست علی کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ اپنے منہ پر آپ تھپڑ مارتے ہوئے بولا۔ "ہاں، کوئی فرق نہیں ہے اب تو میں بھی بے غیرتوں کی صف میں کھڑا ہوگیا ہوں۔ آہ! اس لڑکی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں ابھی مرسکتا ہوں لیکن مرجاؤں گا تو یہ اور ٹھوکریں کھاتی اور بے حیا بنتی چلی جائے گی۔ میں غیرت سے مرکر جو عزت کما کر جاؤں گا، وہ سب خاک میں مل جائے گی۔"

اوصاف بیگم نے نرمی سے کہا۔ "بھائی جو ہوا اس پر خاک ڈالو۔ میں بری عورت سہی مگر دنیا والوں کے سامنے تم کو اور بھولی کو برا نہیں بننے دوں گی۔ آؤ چلو کھانا کھالو۔"

"نہیں، میں نہیں کھاؤں گا اور بھولی کو بھی نہیں کھانے دوں گا وہ اس دہلیز سے سہاگن بن کر نکلے گی یا پھر میرے ساتھ مرجائے گی کھانا لے جاؤ یہاں سے۔"

"واہ۔ اچھی ضد ہے۔ اس ضد سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہوا، اسے برداشت کرلو گے تو جلد ہی کہیں سے رشتہ آجائے گا ارے ہاں یاد آیا۔ کل تو منصور کے

گھر والے تیار تھے بلکہ اب بھی تیار ہوسکتے ہیں۔ میں آج شام ہی کو انہیں تمہارے دروازے پر لاسکتی ہوں۔"

ریاست علی کی آنکھوں میں امید کا دیا ٹمٹمایا۔ اس نے التجا آمیز نظروں سے اوصاف بیگم کو دیکھا۔ ایک لمحہ پہلے اس عورت سے سخت نفرت تھی۔ اب وہی عورت رشتے کی بات آگے بڑھا کر اس کی بیٹی کو عزت سے ٹھکانے لگا سکتی تھی۔ اب اس سے نفرت نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ بولی۔ "بس یوں سمجھو کہ میں نے چٹکی بجائی اور بھولی دلہن بن گئی۔ چلو اب کھالو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "اوصاف! میں نے قسم کھائی ہے۔ قسم نہیں توڑوں گا ہمیں کھلانا چاہتی ہو تو پہلے رشتہ لے آؤ۔ اس سے پہلے ہم باپ بیٹی موت کو بلاتے رہیں گے۔"

"تم شریف لوگوں میں یہی ایک خرابی ہوتی ہے کہ شرافت میں اپنی خرابی کرلیتے ہو۔ ٹھیک ہے میں ابھی منصور کے ہاں جاتی ہوں۔"

وہ کھانے کی ٹرے لے کر آنگن کے دروازے سے باہر چلی گئی۔ ریاست علی نے اس دروازے کو بند کرنے کے بعد کمرے کے دروازے کا تالا کھولا۔ بھولی ایک گوشے میں بیٹھی گرمی سے پسینہ پسینہ ہورہی تھی کھڑکی بھی بند تھی۔ کمرے میں ایسا حبس تھا کہ دم گھٹ رہا تھا۔ وہ دعا مانگ رہی تھی کہ دم گھٹ ہی جائے۔

پندرہ منٹ کے بعد ہی اوصاف بیگم کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہی تھی۔ "بھائی دروازہ کھولو۔ ذرا آکر دیکھو کون لوگ آئے ہیں۔"

ریاست نے آنگن میں آکر دروازے کو کھولا۔ پھر منظور حسن اور ان کی بیگم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر بولا۔ "آیئے تشریف لایئے۔ میں غریب ہوں سمجھ میں نہیں آتا' کہاں بٹھاؤں۔ کیا کروں؟"

منظور حسن اپنی بیگم کے ساتھ آنگن میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ "آپ پریشان نہ ہوں ہم فرش پر بھی بیٹھ سکتے ہیں۔"

ریاست علی نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا......... وہاں چار پرانی کرسیاں اور ایک درمیانی میز رکھی ہوئی تھی۔ بیگم نے اس کمرے میں داخل ہوکر ادھر اُدھر دیکھا'

پھر کہا۔ "آپ لوگ یہاں باتیں کریں مجھے بھولی کے پاس جانے دیں۔ وہ کہاں ہے؟"

اوصاف بیگم نے کہا۔ "وہ سامنے والے کمرے میں ہے' آیئے میں لے چلوں۔"

بیگم نے کہا۔ "بہن خیال نہ کرنا۔ میں اس سے بالکل تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔"

وہ جواب سنے بغیر اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں داخل ہوگئیں۔ دور ایک گوشے میں ایک سکڑی سمٹی سی لڑکی نظر آئی سر کا آنچل گھونگھٹ بن کر اس کے چہرے کو چھپا رہا تھا۔ بیگم نے اپنے آنچل سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "توبہ! یہاں کتنی گھٹن ہے کیا تم بھولی ہو؟"

وہ چپ رہی بلکہ اور سمٹ گئی۔ بیگم نے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ "سردی کا موسم نہیں ہے جو تم سکڑ رہی ہو۔ شرما کر سمٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' کیونکہ میرے یہاں آنے کا مقصد تمہیں معلوم نہیں ہے۔ یقیناً اس حالت میں اپنی ایک غلطی کی سزا پا رہی ہو۔"

وہ بھولی کے سامنے فرش پر دو زانو ہوگئیں۔ "ذرا اپنے چہرے سے آنچل ہٹاؤ میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ پتھر کی طرح اپنی جگہ ساکت رہی۔ صرف سانس لینے کے باعث وہ جاندار سی لگ رہی تھی۔ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ "میں منصور کی ماں ہوں۔"

منصور کی ماں کو دیکھنے کے لئے بھولی کا سر بے اختیار ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اسی لمحے بیگم نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گھونگھٹ کو الٹ دیا۔ یوں لگا جیسے شبنم سے تر بتر ایک تازہ گلاب نگاہوں کے سامنے کھل اٹھا ہو۔ بھولی کا سرخ و سفید چہرہ پسینے اور آنسوؤں میں بھیگ رہا تھا۔ مکھڑے کی ملائم جلد پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ سیاہ زلفیں پسینے سے چپک گئی تھیں' کچھ ادھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ آنکھیں ایسی گہری ایسی پُرکشش تھیں کہ بیگم نے ایسی آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان آنکھوں میں حیا بھی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ منصور کی امی اسے پسند کرنے آئی ہیں۔

بیگم کچھ دیر گم صم سی رہیں۔ جیسے خواب میں کوئی من موہنی سی صورت دیکھی ہو۔

پھر بولیں۔ ”بھئی! اک ذرا اور دیکھنے دو۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میرے بیٹے نے اتنی حسین گڑیا پسند کی ہے۔“

اب وہ گھٹنوں میں منہ چھپانے لگی۔ بیگم نے کوشش کی کہ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اپنی نگاہوں کے سامنے کرلے۔ اس کوشش میں کئی بار بھولی کی جھلک نظر آئی مگر وہ چھپتی ہی رہی۔ بھولی کی اس ادا نے ثابت کردیا کہ وہ بے حد شرمیلی ہے۔ بیگم نے مطمئن ہوکر اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال کر اسے پہنادی۔

☆------☆------☆

شادی ہوگئی۔ بھولی منصور کی دلہن بن کر کوٹھی میں آگئی لیکن یہ نیک کام اوصاف بیگم کے ہاتھوں ہوا وہ بھولی کے میکے سے سسرال تک سب ہی کے اعصاب پر سوار ہوگئی تھی۔ ادھر ریاست علی' ادھر منظور حسن کا پورا خاندان اس عورت کے منہ نہیں لگنا چاہتے تھے۔ وہ کسی وقت بھی ایک شریف خاندان کی عزت کو اچھال سکتی تھی' اس عزت کو جو ریاست علی کے گھر سے منظور حسن کے گھر آگئی تھی۔ اب دونوں گھرانوں کا تعلق اس سے تھا۔

منصور کے والد نے اگرچہ رشوت دے کر تھانے تک پہنچنے والے معاملے کو ختم کردیا تھا تاہم تھانیدار کے پاس وہ معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ بھولی کے باپ کا تحریری بیان یہ ثابت کرتا تھا کہ ایک شریف لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا۔ منصور پر الزام تھا۔ اسی سے شادی بھی ہوگئی تھی لیکن اس بیان سے یہ ظاہر تھا کہ شادی سے پہلے بھاگنے والی اور بھگانے والے کے درمیان ناجائز تعلقات تھے۔ شریف لوگوں کے لئے یہ ڈوب مرنے کی بات ہوتی ہے۔ ریاست علی نے بوکھلاہٹ میں اوصاف بیگم کی بات مان کر وہ تحریری بیان دے دیا تھا اور اب وہ پچھتا رہا تھا۔

اوصاف بیگم بھولی کی سگی بن بیٹھی تھی۔ شادی اور رخصتی کی رسوم ادا کرنے میں پیش پیش رہی تھی حتیٰ کہ رخصتی کے وقت دلہن کے ساتھ اپنی بیٹی پروین کو بھی یہ کہہ کر بھیج دیا کہ دستور کے مطابق پہلی بار دلہن کے ساتھ اس کی کوئی بہن بھی جاتی ہے تاکہ دلہن کو نئے ماحول میں کوئی اپنا بھی نظر آئے۔

دستور اور رسم ورواج پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرسکتا تھا لیکن پروین دلہن کے ساتھ کوٹھی میں آکر جوان لڑکوں سے ہنسنے بولنے لگی۔ یہ بات قابلِ اعتراض تھی۔ منصور کی امی نے پروین کو ایک طرف بلا کر سمجھایا۔ ”بیٹی ہمارے خاندان میں لڑکیوں کا اس طرح ہنسنا بولنا اچھا نہیں سمجھا جاتا' تم عورتوں کے پاس آجاؤ۔“

وہ ناک سکوڑ کر بولی۔ ”او آنٹی! آپ لوگ بہت ہی بیک ورڈ ہیں ابھی تک صرف لڑکیوں کو روکتی ٹوکتی ہیں۔ آخر جن کے ساتھ میں فری ہوکر باتیں کررہی ہوں وہ بھی تو آپ کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بے شرمی تو ادھر سے بھی ہوئی نا؟“

انہیں ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ لاجواب سی ہوکر اس کا منہ تکتی رہ گئیں۔ پروین اونہہ کہہ کر پھر لڑکوں کی محفل میں چلی گئی۔ ولیمے کے دن منظور حسن معزز مہمانوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ ایک بچی نے آکر تعجب سے کہا۔ ”خالو جان! وہ دلہن کے ساتھ جو عورت آئی ہے نا' وہ سگریٹ پی رہی ہے۔“

ایک معزز مہمان نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا منصور میاں کے سسرال میں عورتیں سگریٹ پیتی ہیں؟“

منظور حسن اندر سے تلملا گئے تھے' اوپر سے بات بنائی۔ ”جی نہیں' یہ بچی یوں ہی شرارت سے کہہ رہی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے شریر کہیں کی۔“

انہوں نے لڑکی کی پیٹھ پر پیار سے دھپ جما کر وہاں سے بھگا دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کسی بہانے سے اٹھ کر بیگم کے پاس پہنچے' ان سے پوچھا۔ ”کیا بہو کی طرف سے آنے والی عورتوں میں کوئی سگریٹ پی رہی ہے؟“

بیگم پریشان ہوکر بولی۔ ”کیا بتاؤں اپنی عزت کو اب سنبھال کر رکھنا دوبھر ہوگیا ہے۔ وہ اوصاف بیگم بھولی کے کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تب اس نے سگریٹ بجھا کر پھینک دیا۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچنے لگے کہ اوصاف بیگم اگر خواہ مخواہ رشتہ دار بن کر آئندہ بھی آتی جاتی رہی تو کیسے نبھے گی؟ انہوں نے بڑی توقع سے پوچھا۔ ”بہو تو گھونگھٹ میں رہتی ہے نا؟“

"جی ہاں بہت سلیقہ شعار ہے۔ سر سے آنچل ڈھلکنے نہیں دیتی۔ مہمان عورتیں کچھ پوچھتی ہیں تو وہ بہت مختصر اور بڑا مکمل جواب دیتی ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر تو میرا جی نہیں بھرتا۔ اللہ! میری ہی نظر نہ لگ جائے۔"

ہماری دنیا میں خوبصورتی نہ ہوتی تو ہم بدصورتی کو بھلا نہ پاتے اگر خوشبو نہ ہوتی تو ہم غلاظت کے عذاب میں جیتے رہتے۔ اوصاف بیگم جو زخم دے رہی تھی' بھولی کا حسین وجود اس پر مرہم بن رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دے رہے تھے کہ آس پاس تو کانٹے ہوتے ہی ہیں۔ ان کانٹوں سے قطع نظر ہم نے ایک گلاب کو گھر کی زینت بنا لیا ہے۔

منصور تو پہلے ہی اس کا دیوانہ تھا۔ اب تو دن رات اس کے آنچل سے بندھ کر رہ گیا تھا۔ بھولی جدھر جاتی' ادھر وہ سائے کی طرح چلتا۔ شادی کے فوراً بعد ہی یہ دیکھنے میں آیا کہ بھولی کے میکے سے ہر ہفتہ بلاوا آجاتا تھا۔ وہ ایک دن کے لئے جاتی مگر دو چار دن رہ کر آتی تھی۔ بیگم نے کئی بار دبی زبان میں کہا۔ "بیٹی تمہارا گھر یہ ہے۔ اب میکے میں اتنے دن نہیں رہنا چاہئے۔"

بھولی سر جھکا کر ایک ہی بات کہتی۔ "امی! کیا کروں؟ ابو اکثر بیمار رہتے ہیں۔ باجی اپنے سسرال سے نہیں آتی ہیں۔ میں بھی نہیں جاؤں گی تو ان کا خیال کون رکھے گا؟"

اس بات پر اسے فراخدلانہ اجازت دے دی جاتی تھی منصور بھی اس کے ساتھ جاتا تھا اور زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر گھر واپس آتا تھا۔ ایک دن وہ اوصاف بیگم کے ہاں پہنچا تو ویسے ہی پہلے جیسی جوان لڑکے لڑکیوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ اعظم' جاوید اور آصف وغیرہ بھی موجود تھے لیکن وہاں بھولی کی موجودگی منصور کو بری لگی۔ اس نے کہا۔ "تم اپنے ابو سے ملنے آتی ہو میری اجازت کے بغیر تمہیں باپ کے گھر سے قدم نہیں نکالنا چاہئے۔"

بھولی نے کہا۔ "میں کبھی نہ آتی مگر نورین آج صبح کی فلائٹ سے باہر چلی گئی ہے۔ یہ لوگ اسے ایئرپورٹ تک الوداع کہنے گئے تھے۔ بے بے نے مجھے بلا کر کہا کہ آج میں یہاں رہوں' آپ آئیں گے تو گھر میں مجھے نہ پا کر خود ہی یہاں آجائیں گے۔"

اعظم نے مسکرا کر کہا۔ "بھولی! اتنی تفصیل سے صفائی پیش نہ کرو مانا کہ تمہاری شادی ہوگئی ہے۔ اب تم منصور کی سب کچھ ہو مگر پرانی دوستی کے ناتے ہم بھی ایک ساتھ کچھ وقت گزارنے کا حق رکھتے ہیں۔ کیوں منصور! ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک نہیں ہے۔" منصور نے کہا۔ "میں ایسی محفل میں اپنی بیوی کی شرکت پسند نہیں کرتا جہاں اٹھنے بیٹھنے کا کوئی تعمیری مقصد نہ ہو۔"

اوصاف بیگم نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کیا شادی سے پہلے اس محفل میں تعمیری مقاصد ہوا کرتے تھے؟"

"جی ہاں' میں بھولی کو حاصل کرنے کے مقصد سے آتا تھا۔"

"تو جہاں سے اس نیک کام کا آغاز ہوا تھا اس جگہ کو اب برا نہیں کہنا چاہئے۔"

منصور نے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ آپ نے ہمیں اپنی کسی بہن کے ہاں پہنچا کر اور تھانیدار کو میرے ہاں پہنچا کر ثابت کردیا ہے کہ........"

بھولی نے منصور کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "خدا کے لئے جو کچھ ہوگیا ہے اسے نہ دہرائیں' بے بے بہت اچھی ہے۔ آپ کو پہلے کی طرح ان کی عزت کرنا چاہئے۔ پہلے کی طرح یہاں آنا چاہئے........"

"میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔ چلو اٹھو۔"

اوصاف بیگم نے کہا۔ "بلا سے تم نہ آؤ' مگر بھولی ہم سے الگ نہیں ہے۔ یہ یہاں آئے گی اور میں تمہارے گھر جاکر اسے لایا کروں گی۔"

"میری بیوی میری اجازت کے بغیر تمہارے ساتھ کبھی نہیں آئے گی۔ بھولی! تم ان کے منہ پر کہہ دو تاکہ یہ ہمارے گھر آنے کی زحمت نہ کریں۔"

بھولی پریشان ہو کر کبھی اوصاف بیگم کو دیکھنے لگی' کبھی منصور کا منہ تکنے لگی۔ وہ تذبذب میں تھی۔ منصور نے پوچھا۔ "کیا تم نے سنا نہیں؟ جو بات ہو اسے منہ پر کہہ دینا چاہئے۔ چلو کہہ دو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "انسان کو اپنا پچھلا وقت بھولنا نہیں چاہئے' آپ جانتے ہیں کہ بے بے نے ہمیں بڑا سہارا دیا تھا۔ آگے رشتہ جوڑنا اور پیچھے رشتہ توڑنا اچھی بات

نہیں ہے۔"

"کیا اچھا ہے اور کیا برا' یہ میں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ آئندہ تم یہاں نہیں آؤ گی۔"

"آپ ایسا فیصلہ نہ کریں' میں مجبور ہوں' میں یہاں آؤں گی۔"

"کیا مجبوری ہے؟ کیوں آؤ گی؟ کیا میں تمہارا شوہر نہیں ہوں کیا تم میرا حکم نہیں مانو گی؟"

"م.......... میں .... میں رشتے توڑنے اور دشمنی بڑھانے والا حکم نہیں مانو گی۔"

منصور کی مردانگی کو ٹھیس پہنچی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھولی اسی محفل میں اس کے حکم سے انکار کردے گی وہ بھنا کر بولا۔ "تو پھر جہنم میں جاؤ۔ جب تک تم میری ہم مزاج نہیں بنو گی' میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ غصے میں تلملاتے ہوئے جانے لگا۔ بھولی نے آواز دی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ جھٹک کر وہاں سے چلا آیا۔ شام کو گھر پہنچا تو اس کے جمیل بھائی سعودی عرب سے آئے ہوئے تھے۔ بھائی جان کو خط و کتابت کے ذریعے ہنگامی شادی کی روداد معلوم ہوچکی تھی' اب وہ اپنے والدین سے مزید تفصیلات سن رہے تھے۔ منظور حسن وہ حقائق بیان کررہے تھے جو پیش آچکے تھے اور بیگم صرف بھولی کی تعریفیں کرتے کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔

منصور وہاں پہنچا تو دونوں بھائی گلے لگ گئے۔ جمیل نے پوچھا۔ "دلہن کہاں ہے۔؟ امی کہہ رہی تھیں کہ تم ابھی ساتھ لانے والے ہو۔"

"ایں؟" وہ گڑبڑا گیا۔ شادی کے بعد بھائی سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھولی کی کوئی شکایت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جلدی سے سنبھل کر بولا۔ "وہ اس کے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ بے چارے تنہا بیمار تھے' میں چھوڑ آیا ہوں۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" جمیل نے کہا۔ پھر اپنی امی سے مخاطب ہوا۔ "امی! ہمیں بیمار کی عیادت کے لئے جانا چاہئے۔"

منصور نے جلدی سے کہا۔ "بھائی جان! ان کی طبیعت کچھ زیادہ خراب نہیں ہے۔ بس یونہی بڑھاپے کی وجہ سے.........."

"بڑھاپا بھی ایک بیماری ہے بھئی ہم ضرور جائیں گے۔ امی نے اتنی تعریفیں کی ہیں کہ میں اب دلہن کو دیکھ کر ہی رہوں گا۔"

جمیل کی بات ختم ہوتے ہی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا وہاں بھولی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ برقعے میں تھی۔ چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ جمیل کے سوا سب نے اسے پہچان لیا۔ بیگم فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔ "ہائے دلہن! اکیلی آئی ہو؟ تمہارے ابو خیریت سے ہیں نا؟"

◆ بھولی نقاب کے پیچھے سے منصور کو دیکھ رہی تھی۔ منصور اس کی آمد سے پگھل رہا تھا۔ بھولی نے پیچھے پیچھے آکر یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی تابعدار اور اس کی دیوانی ہے۔ منصور بھی فوراً ہی اپنی امی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "بھولی میں ابھی تمہارے ابو کی بیماری کا ذکر کررہا تھا' کہہ رہا تھا کہ انہیں تمہاری ضرورت ہے تم ابھی نہیں آؤ گی۔ م۔ مگر کیسے آگئیں؟ اوہو۔ سمجھ گیا۔ تمہارے ابو صحت یاب ہوگئے ہیں' ہے نا؟"

اس نے نقاب کے پیچھے سے تائید میں سر ہلادیا۔ امی اپنے سمدھی کی صحت یابی پر خدا کا شکر ادا کرنے لگیں۔ جمیل اپنے بھائی کی بوکھلاہٹ کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے کہا۔ "عجیب بیماری ہے منصور! تمہارے یہاں آنے کے دس منٹ بعد ہی وہ صحت یاب ہوگئے اور دلہن بھی چلی آئیں۔"

بیگم نے کہا۔ "دلہن! یہ ہمارا بڑا بیٹا جمیل ہے۔ برقعہ اتاردو۔"

بھولی کو خیال آیا کہ وہ منصور کے بدلے ہوئے رویے کے باعث ایک بہو کے آداب بھول گئی ہے' اس نے آگے بڑھ کر منظور حسن اور جمیل کو سلام کیا۔ وہ چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے شرما رہی تھی۔ بیگم نے نقاب اٹھا کر بڑے بیٹے کو بہو کی صورت دکھائی۔ جمیل نے کہا۔ "سبحان اللہ! امی آپ صحیح تعریفیں کررہی تھیں۔ دلہن! میں منہ دکھائی کی رسم ادا کرنے کے لئے سونے کے زیورات کا ایک سیٹ لایا ہوں' ابھی سامان

سے نکال کر دوں گا۔"

وہ رونمائی کے باعث شرما کر وہاں سے چلی گئی۔ رات کو خواب گاہ کی تنہائی میں منصور نے پوچھا۔ "کیا تم میرے فیصلے کو تسلیم کر کے آئی ہو؟"

"آپ نے ایک جذباتی فیصلہ کیا ہے۔ آپ یہ بھول گئے ہیں کہ ہم نے شادی سے پہلے مغل پورہ کے ایک مکان میں ایک رات گزار کر بے بے کے ہاتھ میں اپنی ایک کمزوری دے دی ہے۔ ابو کا بیان ان لوگوں کے پاس موجود ہے۔"

"ہے تو کیا ہوا؟ اب ہماری شادی ہوگئی ہے اگر اغوا کی رپورٹ کو سچ مان لیا جائے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ جسے اغوا کیا تھا وہ اب میری بیوی ہے۔"

"میرے ابو یہ بے عزتی برداشت نہیں کریں گے۔ ان کی بیٹی شادی سے پہلے اغوا کی گئی تھی۔ یہ بات عام ہوئی تو وہ مرجائیں گے۔"

"یہ تمہارے ابو کا قصور ہے' انہیں تھانے میں رپورٹ درج نہیں کرانی چاہئے تھی۔"

"آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک جوان بیٹی رات کو گھر سے غائب ہو تو باپ کے پاؤں تلے سے زمین سرک جاتی ہے۔ اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں' ان حالات میں جو جیسا مشورہ دیتا ہے' وہ بوڑھا باپ اسی پر عمل کرتا ہے' بے بے نے موقع سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔"

"میں نہیں چاہتا کہ وہ آئندہ کوئی فائدہ اٹھائے۔ اس لئے تم وہاں نہیں جاؤ گی۔"

"میں محتاط رہوں گی۔ مجھے میکے سے زیادہ اپنے گھر کی عزت عزیز ہے۔ یہاں کسی کی عزت' کسی کی شخصیت پر آنچ نہ آئے۔ اس لئے بے بے سے میل جول رکھنا ضروری ہے۔ غلاظت پر پتھر مارنے سے چھینٹے اُڑتے ہیں۔ دانشمندی یہ ہے کہ ہم اس کے پاس سے گزرتے وقت اپنی ناک پر رومال رکھ لیں۔"

اس نے پیار سے منصور کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اس کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر بولی۔ "اچھے جان! مان جائیں میں بہت پریشان ہوں' آپ محبت نہیں دیں گے تو میں مرجاؤں گی۔"

اس کی اداؤں نے پیار بھری صداؤں نے منصور کو اپنے آگے جھکا لیا۔ اس رات بھولی نے پیار کا سفر طے کرتے ہوئے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ دوسری صبح بیگم نے سنا تو ان کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا۔ انہوں نے بہو کی بلائیں لیں۔ پھر حساب کرنے بیٹھ گئیں کہ تمہارے رشتے داروں تک خوشخبری پہنچانے کے لئے کتنے من مٹھائی کی ضرورت ہوگی۔

جمیل کہیں باہر جانے کے لئے شیو کر رہا تھا۔ اس نے یہ خوشخبری سنی تو کچھ الجھ کر کہا۔ "ابھی تو منصور کی شادی کو پورا ایک ماہ گزرا ہے۔ اس لڑکے کے سسرال والے ہر معاملے میں جلد باز ہیں سسر بیمار ہوتے ہی صحت یاب ہوجاتا ہے اور بیوی شادی ہوتے ہی ایک بچے کا مژدہ سناتی ہے' کمال ہے۔"

جمیل فطرتاً شاعر اور عادتاً سیاح تھا۔ یورپ اور مشرق وسطیٰ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جس کی زمین پر اس کے قدم نہ پڑے ہوں۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا پہنچتے ہی اوصاف بیگم کے تمام اوصاف سن چکا تھا اور تقریباً سمجھ چکا تھا کہ اوصاف بیگم کا تعلق اس چکلے سے ہے جو قانونی طور پر ختم ہوچکا ہے اور غیر قانونی طور سے تھانیدار کی سرپرستی میں اب بھی قائم ہے اور شریفوں کے محلے میں ڈنکے کی چوٹ پر قائم ہے کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

جمیل کسی کا کچھ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ صرف اپنے گھر کو بگڑنے سے بچانے کی فکر ہوگئی تھی۔ کسی کم ظرف کے منہ لگنے سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ اپنے ظرف کے مطابق اپنی عزت کو بحال رکھا جائے۔ وہ خاموش تماشائی کی طرح چپ چاپ منصور' بھولی اور اوصاف بیگم کی باتوں اور حرکتوں کا جائزہ لیتا تھا اور سمجھتا تھا کہ بھولی بذات خود کتنی ہی اچھی ہو۔ مگر وہ اوصاف بیگم کے دباؤ میں ہے بلکہ بھولی کے ابو اور خود جمیل کے والدین اس عورت کو ناپسند کرنے کے باوجود مصلحتاً اسے اپنی سوسائٹی میں برداشت کرتے ہیں۔ کوئی بات برداشت سے باہر ہوتی تو منصور لڑنے پر آمادہ ہوجاتا تھا لیکن والدین سمجھا بجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کردیتے تھے۔

دو ماہ بعد جمیل نے کہا۔ "اب میرے واپس جانے کا وقت آگیا ہے اور اس عرصہ

میں میں نے سمجھا ہے کہ اوصاف بیگم ایک بیماری ہے۔ یہ شریف لوگوں کو لگ جائے تو وہ شرم سے علاج بھی نہیں کراسکتے۔ منصور اور بھولی ہمارے گھر میں یہ بیماری لے کر آئے ہیں' ان دونوں کو گھر سے دور کردیا جائے تو وہ بھی دور رہے گی۔"

"کیا؟" بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔ "بیٹے! کیا تم میرے بیٹے اور بہو کو گھر سے نکال دینے کا مشورہ دے رہے ہو؟"

"جی ہاں' اس طرح کہ میں یہاں سے جاکر منصور کے لئے ویزا بھیج دوں گا وہ میرے پاس آکر وہاں میری دکان سنبھالے گا۔ اس کے پاس انجینئرنگ کا ڈپلومہ ہوگا وہاں بہت اچھی ملازمت مل جائے گی پھر منصور........ بھولی کو بھی وہاں بلالے گا۔ اوصاف بیگم اور اس کے گھر والے بھولی سے رشتہ جتا کر یہاں آتے ہیں۔ وہ نہیں رہے گا تو ان کمبختوں کی آمدورفت میں بھی رفتہ رفتہ کمی آجائے گی' اللہ نے چاہا تو ان سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔"

منظور حسن نے تائید میں سرہلا کر کہا۔ "بہت عمدہ تجویز ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس پر عمل کرکے ہم شر سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔

بیگم نے جمیل سے کہا۔ "بیٹے میں تمہارے باہر رہنے پر اعتراض کرتی تھی۔ اب تم منصور کو بھی لے جاؤ گے' کچھ دنوں بعد دلہن بھی چلی جائے گی پھر میرے پاس کیا رہ جائے گا؟"

"عزت رہ جائے گی۔" منظور حسن نے کہا۔

بیگم روتے بسورتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "یہ کیسی دنیا ہے۔ یہاں کیسا انصاف ہوتا ہے۔ جو برے ہیں۔ جو مجرم ہیں' ان کو ملک بدر کرنا چاہئے مگر ہمارے بچے ملک چھوڑنے پر مجبور ہورہے ہیں۔ کوئی دوسری تجویز سوچو۔ میں منصور کو نہیں جانے دوں گی۔"

"منصور نے شادی سے پہلے دو بڑی غلطیاں کیں۔ ایک تو اوصاف بیگم سے ربط ضبط بڑھایا۔ دوسرے اپنی ایک کمزوری اس عورت کے ہاتھ میں دی۔ امی! آپ یہ سمجھ لیں کہ منصور اپنی غلطیوں کی سزا پانے کے لئے باہر جائے گا۔ آپ کو یہ دکھ بھی سہنا ہوگا۔"

بیگم رونے لگیں۔ بیماری کا علاج نہ رہے تو رونے کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اوصاف بیگم چاہتی کیا ہے۔ بزرگوں کے قول کے مطابق یہی سمجھا جاتا تھا کہ برے لوگ عادتاً ہی خواہ مخواہ اچھے لوگوں کی برائی چاہتے ہیں۔ اس قول کا تجزیہ کیا جائے تو اوصاف بیگم احساس کمتری کا شکار تھی۔ جس گندے ماحول سے آئی تھی وہی گندگی دوسروں پر اچھال کر یہ دکھانا چاہتی تھی کہ سب ہی ایک حمام میں ننگے ہیں۔

غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دو بڑی طاقتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک طاقت محلے کے غنڈے ہوتے ہیں اور دوسری طاقت علاقے کا تھانیدار ہوتا ہے کوئی بھی شریف آدمی ان دو طاقتوں کے آگے سر اٹھا کر بات نہیں کرسکتا۔ اوصاف بیگم کے پاس یہ دو مضبوط بازو تھے۔ ایک دن پتہ چلا کہ محلے کے غنڈوں نے منصور کو گھیر لیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر منصور بے بے سے تڑی دے کر باتیں کرے گا اور بھولی کو بے بے کے ہاں زیادہ سے زیادہ رہنے نہیں دے گا تو ایک دن اسے ہمیشہ کے لئے غائب کردیا جائے گا۔

منصور کو غائب کردینے یا قتل کردینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس کی امی رونے لگیں۔ بیچارے ابو آسمان کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ جمیل اسی شام سعودی عرب کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ اس نے کہا۔ "اوصاف بیگم کی پچھلی تمام حرکتوں سے اور اس دھمکی سے پتہ چلتا ہے کہ اس عورت کو بھولی سے خاص لگاؤ ہے۔"

منظور حسن نے کہا۔ "ہاں بھولی اس گھر میں نہ آتی تو اوصاف بیگم بھی نہ آتی۔"

بیگم نے کہا۔ "جہنم میں جائے بھولی۔ کیوں نہ ہم یہ رشتہ ہی ختم کردیں۔ اس عورت کو بھولی چاہئے ہم بھولی کو لوٹا دیں گے۔ میں منصور سے کہوں گی کہ طلاق دے کر تمام مصیبتوں سے نجات حاصل کرلے۔"

"تم بھول رہی ہو بیگم! بھولی ہمارے بیٹے کی اولاد کو جنم دینے والی ہے۔"

بیگم کو چپ لگ گئی۔ وہ ایک ایک دن گن رہی تھیں پھر یہ کہ بہو ان کے پوتے یا پوتی کو ان کی گود میں دینے ہی والی ہے۔ ایسی خوش بختی کے دنوں میں وہ بیٹے سے بہو کو طلاق نہیں دلاسکتی تھی۔ بس بیٹے کی سلامتی کے لئے ان کے منہ سے ایسی بات نکل گئی تھی۔ ورنہ شریفوں کے ہاں طلاق بہت بڑی گالی ہوتی ہے۔

وہ پورا خاندان بد حواس سا ہوگیا تھا۔ بھولی اور منصور کی ازدواجی زندگی نے اس خاندان کے افراد کو دوراہے پر لاکر کھڑا کردیا تھا۔ ایک راہ پر بھولی کے لئے طلاق تھی۔ طلاق نہ دی جاتی تو دوسری راہ پر منصور کی زندگی غنڈوں کے رحم وکرم پر تھی۔

اب بوڑھے والدین کی بھوک مرگئی تھی۔ نیند اڑگئی تھی' عزت بڑی مہنگی لگ رہی تھی کسی بازار سے خریدی نہیں جاسکتی تھی۔ اب محض عزت ہی مسئلہ نہ تھا' بیٹے کی سلامتی کی بھی فکر تھی۔ جمیل نے رخصتی کے وقت کہا۔ "ہمیں طلاق کے متعلق نہیں سوچنا چاہئے۔ میں وہاں پہنچتے ہی جلدی سے جلدی منصور کو اپنے پاس بلالوں گا۔ اس طرح آپ لوگوں کو منصور کی طرف سے اطمینان حاصل ہوجائے گا۔"

☆------☆------☆

کہانی کے ایک اور ایسے ہی موڑ پر جمیل صاحب میرے پاس تشریف لائے میں اپنے ایئر کنڈیشنڈ دفتر کے ایک کیبن میں بیٹھا ایک کہانی کیسٹ میں ریکارڈ کررہا تھا۔ خبر ملی کہ جمیل صاحب ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ میں فوراً ہی کیبن سے باہر آیا۔ ہم گلے لگ گئے۔ دس برس پہلے لاہور میں ہماری دوستی کی ابتدا ہوئی تھی۔ اب یہ دوستی بھائی کے رشتے میں تبدیل ہوگئی تھی۔

انہوں نے کہا۔ "نواب بھائی! آپ کے لئے کہانی کا ایک زبردست موضوع لایا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "لوگ مڈل ایسٹ سے تحفے لاتے ہیں آپ یقیناً میرے مزاج کے مطابق تحفہ لائے ہیں۔"

"میں مڈل ایسٹ سے نہیں لاہور سے آرہا ہوں اور ایک بہت بڑے مسئلے سے نمٹ کر آرہا ہوں۔ اب آپ اس مسئلے کو کہانی بناکر پیش کریں گے۔"

لنچ کا وقت ہوگیا تھا۔ میں نے ملازم کو کھانا لانے کے لئے کہا جمیل صاحب ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر شروع ہوگئے۔ اوصاف بیگم منصور اور بھولی کے کردار پر مشتمل داستان سنانے لگے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس دوران ملازم نے کھانا لاکر میز پر رکھ لگایا۔ وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے۔ میں نے کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر طلاق ہوگئی۔"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ میرے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ میں رہ گیا۔ میں نے کہا۔ "بھئی آپ یوں دھماکہ کرنے کے انداز میں کہانی نہ سنائیں۔ ذرا ترتیب سے بتائیں کہ یہ معاملہ طلاق تک کیسے پہنچا؟"

انہوں نے کہا۔ "میں نے والدین سے مشورہ کرنے کے بعد منصور کو اپنے پاس سعودی عرب بلوالیا تھا۔ وہاں اسے اچھی ملازمت مل گئی ہے لیکن لاہور سے ابو کے خطوط آتے رہے کہ اوصاف بیگم بہت زیادہ پریشان کرنے لگی ہے۔ وہ بھولی کو اپنے ساتھ یہ کہہ کرلے جاتی ہے کہ جب شوہر نہیں ہے تو ہماری لڑکی ہمارے پاس رہے گی۔"

میں نے یقین سے کہا۔ "بھولی نہیں جاتی ہوگی۔"

"یہی تو حیرانی ہے کہ وہ اس کے ساتھ جاتی تھی اور اسی کے ہاں رہتی تھی۔ منصور نے اسے خط لکھا۔ تاکید کی کہ وہ ابو امی کے پاس آجائے بھولی نے جواباً لکھا کہ جب منصور آئے گا تو وہ اس کے گھر آئے گی' ورنہ بے بے کے پاس رہے گی۔ تب منصور نے غصے میں خط لکھا کہ یہ شریف زادیوں کے لچھن نہیں ہیں۔ اگر وہ اوصاف بیگم کا خود ساختہ میکہ چھوڑ کر سسرال نہیں آئے گی تو اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گا۔"

جمیل صاحب نے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ "بھولی نے جواب لکھا کہ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ وہ طلاق لینا چاہتی ہے.......... منصور جذباتی لڑکا ہے' وہ طیش میں آکر طلاق دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ میاں بیوی کے درمیان سینکڑوں میل کی دوری ہے' پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آکر معاملات کو سمجھیں' اپنی اپنی محبت کو تولیں۔ پھر طلاق کی بات بولیں۔"

"اچھا تو پھر منصور بھولی سے ملنے لاہور آیا تھا؟"

"نہیں اس وقت وہ لاہور نہیں جاسکتا تھا کیونکہ نئی ملازمت تھی چھٹی مل نہیں سکتی تھی۔ اس نے خط لکھ دیا کہ ایک سال بعد آکر فیصلہ کرے گا۔ فی الحال بھولی کو سسرال واپس آجانا چاہئے۔ بیس دن کے بعد معلوم ہوا کہ بھولی واپس آگئی ہے۔ عجیب چکربازیاں

تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم جوان بیٹوں کی عدم موجودگی میں ہمارے بوڑھے والدین کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔"

"اچھا تو پھر کوئی بات ہو گئی؟"

"ہاں۔ امی کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ بھولی ہمارے ہاں واپس نہ آتی تو بہتر ہوتا۔ کیونکہ اس کے ساتھ پروین رہنے آئی ہے۔ اب روزانہ اس کے بوائے فرینڈ ہمارے گھر اس سے ملنے آتے ہیں۔ ابو اپنے کمرے میں نماز پڑھتے ہیں تو ادھر دوسرے کمرے میں بلند آواز سے کیسٹ ریکارڈر آن کر دیا جاتا ہے سراسر شیطانی حرکتیں جاری رہتی ہیں۔ یہاں میرے والدین اور وہاں پردیس میں ہم دونوں بھائی اس قدر پریشان رہنے لگے کہ نہ پیٹ بھر کر کھاتے تھے نہ نیند بھر کر سوتے تھے۔ چونک چونک کر اٹھ جاتے تھے کہ پتہ نہیں ہمارے والدین کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہو گا۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ ہم چپ چاپ کھاتے رہے اور سوچتے رہے پھر جمیل صاحب نے کہا۔ "منصور نے ایک ہم وطن کے ذریعے دستی خط بھیجا۔ بھولی کو حکم دیا کہ وہ تنہا سسرال میں رہے یا پھر خدا کے لئے اوصاف بیگم کے ہاں جاکر ہمارے والدین کا پیچھا چھوڑ دے۔ کچھ عرصے بعد بھولی نے منصور کو لکھا کہ اگر منصور اپنی اور اپنے خاندان کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے طلاق دے دے۔ وہ مہر کی رقم معاف کرتی ہے۔"

جمیل صاحب کی باتیں سن کر مجھے یوں لگا جیسے بھولی کسی بہت ہی زہریلے کانٹے کی نوک پر کھڑی ہے اگر وہ اوصاف بیگم کی طرح گندی ذہنیت رکھتی تو طلاق کا مطالبہ کرتے وقت دھمکی آمیز الفاظ استعمال کرتی مگر وہ التجا کر رہی تھی' اسے سمجھا رہی تھی کہ اسی میں ایک شریف گھرانے کی بھلائی ہے۔

لیکن طلاق نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک بچہ جنم لینے والا تھا۔ جس کا باپ منصور تھا اور ماں بھولی تھی۔ انہیں طلاق لے دے کر ایک بچے کی زندگی برباد کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

جمیل صاحب نے کہا۔ "نواب بھائی! پھر ایک دن ابو کا خط آیا انہوں نے لکھا تھا دلہن نے ایک بیٹی کو جنم دیا ہے۔ ہمیں کسی نے زچگی کی اطلاع نہیں دی۔ تمہاری امی

پوتے پوتی کو گود میں کھلانے کے لئے دن گنتی رہتی تھیں' اسی حساب سے وہ بھولی سے ملنے گئیں تو معلوم ہوا کہ زچگی کو چار ہفتے گزر چکے ہیں۔ تمہاری امی نے شکایت کی تو اوصاف بیگم نے جواب دیا۔ بیٹا ہوتا تو ہم خبر بھیج دیتے کیونکہ بیٹا تمہارا ہوتا........ بیٹی ہماری ہے۔ ہمارے خاندان میں بیٹی کا بڑا مان ہوتا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے جمیل سے پوچھا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ "طوائفوں کے ہاں صرف بیٹی کا مان ہوتا ہے۔ شریف گھرانوں میں بیٹا' بیٹی دونوں سے محبت کی جاتی ہے۔"

"جی ہاں اب اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اوصاف بیگم اور اس کے خاندان کو بدنام محلے سے نکالا گیا تھا۔ وہ غلاظت نیک نام محلوں میں پھیل گئی ہے۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"اوصاف بیگم نے صاف کہہ دیا کہ بھولی اور اس کی بیٹی ہمیں اب واپس نہیں ملیں گی۔ اگر ہمیں اپنی عزت پیاری ہے تو ہم جلد سے جلد منصور سے بھولی کو طلاق دلا دیں۔ مہر کی رقم جو پچیس ہزار ہے وہ بھولی نہیں مانگے گی۔ یہ بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ منصور کو چھٹی لے کر جانا پڑا۔ وہاں بھولی اس سے ملنے سے کترانے لگی۔ منصور نے بھولی کے باپ سے ملاقات کی۔ بیچارے ریاست علی اس عرصہ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے۔ بستر سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ کسی سے بولتے نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے زبان فالج زدہ ہو گئی ہے منصور ان سے مایوس ہو کر اوصاف بیگم کے پاس گیا۔ وہ بولی۔ "بھولی کو طلاق دو اور ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔"

منصور نے کہا۔ "میری بیٹی مجھے واپس کرو میں طلاق دے دوں گا۔"

"کس کی بیٹی؟ کیسی بیٹی؟ یہاں تمہاری کوئی نہیں ہے۔ عدالت میں دعویٰ کرو گے تو بھولی کہہ دے گی کہ اس کا باپ کوئی اور ہے۔"

منصور کے دماغ کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ غصے سے چیخ کر بولا "یہ بات اگر بھولی اپنی زبان سے کہہ دے تو میں اس کے منہ پر تھوک کر چلا جاؤں گا۔"

اسی وقت بھولی پروین کے کمرے سے نکل کر دروازے پر آئی اور گہری سنجیدگی سے

بولی۔ "میں یہی کہتی ہوں۔ آپ میرے منہ پر تھوک کر چلے جائیں۔"

منصور نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھولی! میں نے تمہارے ساتھ بہت اچھے دن گزارے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم ایسی نہیں ہو' جیسا کہہ رہی ہو۔ بھولی! ہم نے اپنی اولاد کے ساتھ اپنے والدین کے ساتھ ایک صاف ستھری خوشگوار زندگی گزارنے کے خواب دیکھے ہیں۔ اب میں باہر خوب کما رہا ہوں' اب میں تمہیں.........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بھولی نے ایک دھڑاکے سے دروازے کے دونوں پٹ بند کردیئے۔ پھر اندر سے چیخ کر بولی۔ "چلے جایئے یہاں سے میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میں طلاق لے کر رہوں گی' اور بچی میرے پاس رہے گی۔ اس لئے کہ یہ بچی اور کسی کی ہے۔ آپ کی نہیں ہے' چلے جایئے یہاں سے چلے جایئے.........."

بس وہ بھولی سے آخری ملاقات تھی' اس کے بعد منصور نے طلاق دے دی۔ بچی کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ ہم اس ننگے پن کے متحمل نہیں تھے کہ بھولی بھری پنچایت میں بچی کو ناجائز کہہ کر منصور کی مردانگی کا مذاق اڑاتی۔"

جمیل صاحب یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔ کھانا ختم ہوچکا تھا اور اب ہم چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا یہ سچی کہانی ختم ہوگئی؟"

"جی ہاں' میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے اپنے مخصوص انداز میں لکھیں' پڑھنے والے اسے کہانی سمجھ کر ہی پڑھیں گے تو سبق حاصل کریں۔"

"اس کہانی سے نہ کوئی متاثر ہوگا اور نہ ہی سبق حاصل کرے گا۔"

جمیل صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا اس کہانی میں ایک اہم سماجی مسئلہ نہیں ہے کہ چکلے سے نکلی ہوئی غلاظت شریفوں کے محلوں میں پھیل رہی ہے؟ کیا یہ گہرا طنز نہیں ہے کہ قانون کے محافظوں میں بھی کچھ غلط قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور اپنی سرپرستی میں گناہ اور جرائم کو پھیلاتے ہیں؟ کیا یہ بات سامنے نہیں آتی کہ اکثر سر ڈھانپ کر رہنے والی لڑکیاں اچانک ہی آنچل کے تقدس کو پامال کردیتی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں اس کہانی میں سب کچھ ہے لیکن یہ کہانی ابھی ادھوری ہے اور اس میں آنچل کے تقدس کو ٹھیس پہنچنے والی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ بھولی سمجھ میں

نہیں آتی کہ وہ ہے کیا چیز؟ اور اوصاف بیگم سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ایک شریف خاندان والوں کو کیوں پریشان کرتی رہی۔ آخر کوئی تو لالچ ہوگا؟" میں نے چائے کا آخری گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "اگر اوصاف بیگم لالچی ہوتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے آپ کے والدین سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتی یا بھولی کے ذریعے معلومات حاصل کرکے آپ کے ہاں چوری کرواسکتی تھی۔ کچھ نہ سہی' وہ طلاق کے وقت مہر کی رقم وصول کرلیتی' پچیس ہزار روپے کم نہیں ہوتے۔ پھر کیا بات ہے کہ اوصاف بیگم نے شادی کرائی اور اسی اوصاف بیگم نے کسی مفاد کے بغیر طلاق بھی دلوادی؟"

جمیل صاحب نے کہا۔ "جن کے دماغ میں انتشار ہوتا ہے' وہ دوسرے محبت کرنے والوں کے درمیان بھی انتشار پیدا کرتے ہیں۔ اوصاف بیگم خود بری ہے اس لئے دوسروں کی برائی چاہتی ہے' ان پر کیچڑ اچھالتی ہے اور یہ دکھاتی ہے کہ سب ہی اس کی سطح کے لوگ ہیں۔"

"جمیل صاحب! آپ کی یہ منطقی باتیں سمجھ میں آتی ہیں' لیکن میں اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اوصاف بیگم اور بھولی کا صحیح پس منظر معلوم کرنا چاہوں گا۔ مجھے اس سلسلے میں ٹھوس دلائل کی ضرورت ہے۔ آپ میرے صرف ایک سوال کا جواب لاکر دیں۔ میں لکھنا شروع کردوں گا۔ سوال یہ ہے کہ طوائفیں تو دولت پر جان دیتی ہیں۔ اوصاف بیگم نے طلاق کے وقت نہ تو بھولی کے زیورات کا اور نہ ہی پچیس ہزار روپے جیسی خطیر رقم کا مطالبہ کیا۔ آخر کیوں؟"

جمیل صاحب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "کسی بھی قلم کار کو آپ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے یعنی کسی بھی مسئلے پر قلم اٹھانے سے پہلے سوالنامہ تیار کرنا چاہئے۔ میں آپ کے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔"

☆------☆------☆

ایک روز منصور میرے دفتر میں آیا۔ اچھا قد آور اور خوبرو جوان ہے لڑکیاں اسے دیکھتی تو ہوں گی ایک بار' اور دیکھنے کے بعد خواب ضرور دیکھتی ہوں گی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری تھی۔ تعارف کے بعد میں نے غور سے دیکھا تو وہ بجھا بجھا سا نظر آیا۔ میں

نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا بھولی یاد آتی ہے؟"

اس کا سر جھک گیا۔ وہ ڈائری اس کے دونوں ہاتھوں میں یوں تھی جیسے وہ درد کی صلیب اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کھو دینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے جانے والی چیز ہماری جان تھی۔ ہمارا ایمان تھی۔"

"کیا تمہارے بھائی جان کو میرے سوال کا جواب مل گیا؟"

"جی ہاں' مجھے مل گیا۔ بھائی جان نے کہا ہے کہ میں اسے آپ کے پاس پہنچا دوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈائری میرے آگے رکھ دی۔ پھر کہنے لگا۔ "طلاق دینے کے بعد مجھے بھولی سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ میری خواب گاہ میں اس کا جو سامان موجود تھا' اسے میں نے باہر پھینک دیا۔ صرف گوٹے کناری والا ایک دوپٹہ رکھ لیا۔ جو سہاگ رات کو اس کے سر پر تھا۔"

"تم نے سہاگ کا آنچل کیوں رکھ لیا؟"

"عبرت حاصل کرنے کے لئے۔ ہمیشہ یاد رکھنے کے لئے کہ آنچل کے سائے میں بدکاری بھی ہوتی ہے۔ آئندہ مجھے سوچ سمجھ کر آنچل کا انتخاب کرنا چاہئے۔"

میں نے ڈائری کو کھولتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ بھولی کی ہے؟"

"نہیں میری ہے۔ جب ہمارے تعلقات اچھے تھے تو شادی کے بعد دو ماہ تک وہ میرے ساتھ خواب گاہ میں رات گزارتی رہی۔ میں سو جاتا تب بھی وہ جاگتی رہتی تھی اور اس ڈائری میں بہت سی باتیں لکھتی رہتی تھی۔ یہ پانچ برس پرانی ڈائری ہے۔ میں اس میں اپنے پسندیدہ اشعار لکھا کرتا تھا۔ بہت سے اوراق سادہ رہ گئے تھے۔ بھولی نے انہیں سیاہ کردیا۔ اس سیاہی میں آپ کے سوال کا روشن جواب ہے۔"

ڈائری کے اندر ایک لفافہ تھا۔ میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اس نے کہا۔ "یہ خط بھولی نے میرے پتے پر ارسال کیا تھا۔ پہلے آپ چھ ستمبر کا ورق الٹ کر ڈائری پڑھیں' اس کے بعد یہ خط پڑھیے گا۔"

میں نے اوراق الٹ کر دیکھا۔ چھ ستمبر کے صفحہ سے بھولی نے لکھنا شروع کیا تھا۔

"منصور!

میرے آنچل!

میرے آسمان!

میں چپکے چپکے مر رہی ہوں۔ سوچتی ہوں آخری ہچکی سے پہلے اپنی صفائی میں کچھ لکھ دوں۔ جب میرا بھید کھلے گا۔ جب میں آپ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی حقدار نہیں رہوں گی تب میری یہ تحریر شاید آپ کے دل میں اتر جائے۔

منصور! کبھی میں ایسی تھی کہ میرے سر سے آنچل نہیں ڈھلکتا تھا۔ میں کسی مرد کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتی تھی۔ کبھی اپنے ہونے والے دولہا کا خیال آتا تو میں شرم سے پسینہ پسینہ ہوجاتی تھی لیکن اوصاف بیگم نے پڑوس میں آباد ہوکر رفتہ رفتہ کیسے میری شرم دھو ڈالی۔ یہ سب کچھ مجھے تفصیل سے یاد نہیں ہے۔ اتنا قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں محبت کے نام پر لٹ گئی۔

مجھے لوٹنے والا اعظم ہے' پہلے میں اس سے متاثر ہوئی پھر محبت ہوگئی۔ پہلی بار جب اس نے مجھے آغوش میں لیا تو میں رونے لگی کیونکہ میں ماں باپ کے سوا کسی اور کی آغوش میں جانے کو گناہ سمجھتی تھی اور یہ گناہ تھا لیکن اوصاف بیگم نے سمجھایا کہ یہ گناہ نہیں ہے۔

پھر پروین اور نورین بھی مجھے دن رات سمجھانے لگیں۔ گناہ کو محبت کا خوبصورت سا نام دے کر میرے اندر شوق کی چنگاریاں بھڑکانے لگیں۔ اب سوچتی ہوں کسی کو کیا الزام دوں۔ میں نادان نہیں تھی' مگر نادان تھی۔ گناہ سے ڈرتی تھی مگر اعظم کی قربت کے لئے مرتی تھی۔ پتہ نہیں اس نے کیا جادو کردیا تھا' ایک رات میں اس کی آغوش میں مر گئی.........."

میری نظریں ڈائری کے ورق پر جمی ہوئی تھیں۔ وہاں جو الفاظ تھے' وہ بھولی کا سراپا

بن کر وہ مناظر پیش کر رہے تھے جس سے وہ لڑکی گزر تی رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اوصاف بیگم راستے ہموار کر رہی تھی اور اعظم بھولی کے بھولپن سے کھیل رہا تھا۔ انہی دنوں منصور اس محفل میں پہنچ گیا۔

بھولی نے جب پہلی بار منصور کو دیکھا تو یہ سوچ کر اسے صدمہ ہوا کہ منصور کا بھولپن بھی وہاں داغدار ہوگا۔ پروین یا نورین اسے پھانس لے گی مگر دوسرے ہی دن سے بھولی نے محسوس کیا کہ منصور اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ باتوں ہی باتوں میں اپنی محبت کا اظہار کر دیتا تھا اور وہ انجان بن جاتی تھی۔ جیسے کچھ سنا ہی نہیں' کچھ سمجھا ہی نہ ہو۔ ان دنوں اس کے دل و دماغ پر اعظم چھایا ہوا تھا۔

اوصاف بیگم کے ہاں آتے جاتے رہنے سے بھولی کو بہت سی معلومات حاصل ہونے لگیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ اوصاف بیگم کا نام نہاد شوہر بڈھا حرام تھا۔ اسی لئے اوصاف بیگم رئیس زادوں کو پھانس کر اپنے گھر بلاتی تھی۔ آصف' جاوید اور منصور اسی طرح پھنس کر پروین اور نورین کے ساتھ کیرم اور لوڈو وغیرہ کی بازیاں کھیلتے اور ہارتے تھے اور روز اپنی جیبوں سے رقمیں نکال کر ہار جیت کے بہانے اس گھر کا چولہا گرم رکھتے تھے۔

بھولی کو اس گھر کا ننگا پن رفتہ رفتہ معلوم ہونے لگا تھا لیکن وہ پوری طرح اعظم کے دام میں آچکی تھی۔ اعظم کوئی شریف زادہ نہیں تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ اوصاف بیگم کی برادری کا ایک جوان ہے۔ ایک دن پروین نے بھولی کو اس کی شرمناک تصویریں دکھائیں۔ اسے دیکھتے ہی بھولی کا دم نکل گیا۔ تصویر میں اعظم اور اعظم کے ساتھ بھولی ایسی حالت میں تھی کہ خود اپنی وہ حالت دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اچانک اپنے بال نوچ کر اپنے منہ پر طمانچے مار مار کر پروین کو جھنجھوڑ کر پوچھنے لگی۔ "یہ بے حیائی کس نے کی ہے؟ کس نے ہماری تصویر اتاری ہے؟ میں مرجاؤں گی.......... میں زندہ نہیں رہوں گی۔"

"زندہ تو رہنا پڑے گا۔ اگر غلطیاں کرنے والوں کے لئے مرنا آسان ہوتا تو آج ہماری دنیا میں کوئی غلط کار نہ ہوتا۔" اوصاف بیگم نے اسے سمجھایا کہ وہ مرجائے گی تو بدنامی پھر بھی زندہ رہے گی اور بدنامی زندہ رہے گی تو اس کا غیرت مند باپ ریاست علی

زندہ نہیں رہے گا۔ اس کی باجی جو بیاہ کر اچھے خاندان میں گئی ہے' وہاں پر سسرال والے تھوکیں گے۔

اس دن کے بعد بھولی اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ ہوگئی۔ وہ اوصاف بیگم کے آنگن میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ اگر نہ جاتی تو اس کی تصویر آنگن سے باہر آجاتی۔ باپ سے غلطیوں کو چھپانے کے لئے اسے اوصاف بیگم کے سائے میں رہنا پڑا۔ پھر اس گھر میں غیر ممالک سے ایجنٹ آنے لگے۔ اوصاف بیگم نے بھولی کو بتایا کہ لڑکیاں باہر ملکوں میں جا کر محنت مزدوری کرتی ہیں اور عزت آبرو سے لاکھوں روپے کماتی ہیں۔ وہ ایجنٹ پہلے ضرورت مند لڑکیوں کی تصویریں لے جاتے ہیں پھر تصویروں کے ذریعے جو منتخب ہوجاتی ہیں انہیں باہر بھیج دیا جاتا ہے۔

بھولی کو جب یہ معلوم ہوا کہ پروین اور نورین کے علاوہ اس کی بھی ایک تصویر بھیجی گئی تھی تو اس نے اس حرکت پر سخت اعتراض کیا۔ مگر وہ اعتراض ہی کر سکتی تھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر نہیں جائے گی ویسے پتہ نہیں کیا بات ہوگئی کہ صرف نورین کی تصویر پسند کی گئی۔ ایجنٹ آیا' معاہدہ ہوا اور پھر بقول اوصاف بیگم خوبصورت نورین (عزت) آبرو سے لاکھوں روپے کمانے باہر چلی گئی۔

اوصاف بیگم چاہتی تھی کہ بھولی کے تعلقات منصور سے ہوجائیں لیکن بھولی منصور کو فریب نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب پہلی بار اوصاف بیگم اسے منصور کے ساتھ اپنے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چائے بنانے کے بہانے سے باہر گئی تو بھولی نے چپکے سے منصور کو مشورہ دیا کہ وہ اس ماحول میں نہ آیا کرے۔ یہی مشورہ منصور نے بھولی کو دیا۔ دونوں کے دل میں نیکیاں تھیں۔ دونوں اس ماحول سے بیزار تھے اور دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ اوصاف بیگم چولہے پر چائے کا پانی رکھنے کے بعد واپس آکر باہر کھڑی ان کی باتیں سن رہی ہے۔

بھولی کو بعد میں پتہ چلا کہ اوصاف بیگم اپنے ماحول کے خلاف باتیں سن کر طیش میں آگئی تھی اور اسی وقت بھولی اور منصور کو بری طرح پھانسنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ منصوبہ یہ

تھا کہ وہ بھولی کو اپنی بہن کے ہاں لے جائے گی اور وہاں منصور کو بلائے گی۔ پھر تھانیدار یہ کیس بنائے گا کہ وہ دونوں اس گھر میں منہ کالا کرنے گئے تھے۔ یہ کیس باقاعدہ تھانے میں درج نہیں ہوگا کیونکہ اوصاف بیگم اور اس کی بہن بھی اس میں ملوث ہوجاتیں۔ وہ محض بھولی جیسی شریف زادی اور منصور جیسے لڑکے کے شریف والدین کو اپنے آگے جھکانا چاہتے تھے۔ اوصاف بیگم بتانا چاہتی تھی کہ ہمارا ماحول گندہ ہے تمہاری اولاد گندی ہے۔ ہم پر کیچڑ اچھالنے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

لیکن بعد میں اوصاف بیگم کا منصوبہ ذرا بدل گیا۔ اسی شام بھولی پریشان حال روتی ہوئی اوصاف بیگم کے پاس آئی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اوصاف بیگم نے اپنی برادری کی ایک عورت کو بلا کر بھولی کا معائنہ کرایا تو ماں بننے والی بات کی تصدیق ہوگئی۔

پھر تو اس کنواری ماں کے ہوش اڑ گئے۔ کتنی ہی دیر تک وہ سکتے کے عالم میں پڑی رہی۔ اس کے کانوں میں اوصاف بیگم زہر ٹپکا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ "غور سے سنو بھولی! اعظم رشتے میں میرا بھانجا ہے۔ وہ تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔ اب تمہارے سامنے دو راستے ہیں یا تو مرجاؤ یا میرے مشوروں پر چلتی رہو۔ بدنامی ایک بلا ہے جو تمہارے بعد تمہارے باپ کو کھائے گی۔ تمہاری خاندانی شرافت کو کھائے گی۔ میرے کہنے پر چلتی رہو گی تو کوئی تم پر انگلی نہ اٹھا سکے گا۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ میں تمہارے ظاہر ہونے والے گناہ کو چھپانے کے لئے منصور سے تمہاری شادی کرا سکتی ہوں۔"

تب پہلی بار بھولی کو منصور ٹھنڈی چھاؤں کی طرح محسوس ہوا۔ اوصاف بیگم کہہ رہی تھی۔ "اعظم سے دھوکہ کھا کر منصور کو دھوکہ نہیں دو گی تو دنیا تمہیں جینے نہیں دے گی۔ منصور اس ہونے والے بچے کو اپنا ہی بچہ سمجھے گا۔ بولو اس سے شادی کرو گی؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "ابو کو معلوم ہوگا تو وہ مرجائیں گے۔ بدنامی کوئی نہیں چاہتا۔ میں بھی نہیں چاہتی۔ بے بے! تم جو کہو گی، میں وہ کروں گی۔"

اوصاف بیگم نے کہا۔ "ٹھیک ہے کل تم اپنے رشتے دار کے ہاں شادی میں جانے والی ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ یہاں سے شادی میں جانے کے لئے نکلو۔ ادھر پروین تمہیں

میری بہن کے پاس پہنچادے گی۔ وہاں تم منصور کے ساتھ ایک رات گزارو گی۔"

"نہیں بے بے! یہ بے حیائی ہے، گناہ ہے، مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔"

"میں تمہیں غلط راستے پر نہیں لگانا چاہتی۔ مگر تم سے ایک غلطی ہو چکی ہے، ایک غلطی کو چھپانے کے لئے دوسری دس غلطیاں کرنا پڑتی ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں آج ہی منصور سے تمہاری شادی کرادیتی مگر رشتے کی بات طے ہونے اور شادی کی تاریخ مقرر ہونے میں سال چھ مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ ہم منصور کے گھر والوں کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ تمہیں ایک ماہ کے اندر دلہن بنا کرلے جائیں۔ انہیں پھانسنے کے لئے ایک ہی ترکیب ہے۔ منصور سے ایک بار مل لو۔ پھر وہ بچہ اسی کا کہلائے گا۔ بولو منظور ہے؟"

وہ ہر بات بھولی کی زبان سے قبول کرواتی تھی۔ جب بھولی نے اپنی رضامندی اپنی زبان سے ظاہر کردی تو اسے ایک کھٹکا سنائی دیا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو سرہانے کیسٹ ریکارڈر رکھا ہوا تھا جب سے وہ دائی ماں بننے کی منحوس خبر سنا کر گئی تھی تب سے بھولی کو ہوش نہیں تھا۔ ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ سرہانے پروین بیٹھی ریکارڈنگ میں مصروف تھی۔

اوصاف بیگم نے مسکرا کر بھولی سے کہا۔ "ہمارے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کرنا ہم اس بات کو ریکارڈ رکھنا چاہتے ہیں کہ حقیقتاً تم اعظم کے بچے کی ماں بننے والی ہو کیونکہ تم سے لڑکی پیدا ہوگی تو وہ ہماری ہوگی۔ ہمارے خاندان میں یہی ہوتا ہے اگر لڑکا ہوا تو وہ تم شریف لوگوں کا ہوگا۔"

بھولی نے آنکھیں بند کرلیں۔ شرم سے چھپنے کی کوئی جگہ نہ ہو تو انسان اپنے پیچھے ہی چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہوسکتی تھی کہ وہ اپنی عزت اپنے باپ کی غیرت اور اپنے خاندان کی شرافت کا بھرم رکھنے کے لئے اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والی بچی کو ایک ننگے خاندان میں دے گی۔ دنیا میں ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے بڑی سے بڑی غلطی ہوتی ہے لیکن اس کی ایسی شرمناک سزا نہیں ملنا چاہئے جیسی بھولی کو مل رہی تھی۔ منصور سے شادی کے بعد بھی وہ خدا کو خوب یاد کرتی۔ خوب توبہ کرتی تھی مگر توبہ قبول نہیں ہوتی تھی۔

ستم یہ تھا کہ وہ شریف زادی تھی۔ اگر غلط ماحول میں پرورش پاتی تو اوصاف بیگم کی ننگی چالوں کو ہنس بول کر قبول کر لیتی لیکن جس میں انسانیت ہوتی ہے ان کا ضمیر بڑا ظالم ہوتا ہے۔ بھولی کا ضمیر اسے یہ کہہ کر مارتا تھا کہ وہ منصور کے خاندان کی عزت کو بھی خاک میں ملانے آئی ہے۔ ایک تو منصور کی دیوانہ وار محبت نے اسے تحفظ دیا تھا۔ اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ دنیا میں ہر کوئی اعظم کی طرح نہیں ہوتا۔ دوسرے امی اور ابو کا حسنِ سلوک ایسا تھا کہ وہ ندامت سے زمین میں گڑ جاتی تھی۔

اس نے کئی بار اوصاف بیگم سے التجا کی۔ "بے بے وہ انتہائی شریف لوگ ہیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر میرے اندر کانٹے چبھتے رہتے ہیں میرا جی چاہتا ہے ان سے چیخ کر کہہ دوں کہ میں ان کی بہو بننے کے قابل نہیں ہوں۔"

"اونہہ۔ تو پھر کہہ دو۔"

"میں زبان کھولوں گی تو میرے ابو کسی کو منہ دکھانے سے پہلے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔"

"تو پھر منصور سے طلاق لے لو۔"

طلاق کے نام پر بھولی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ پہلے اس نے بچے کی خاطر منصور کو محض ڈھال بنانے کے لئے شادی کی تھی۔ اب وہی منصور اس کے آنچل کی لاج اور اس کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا۔ اسے پاکر وہ نصیب والی بن گئی تھی۔ طلاق لے کر بدنصیب نہیں بننا چاہتی تھی۔ البتہ کئی بار یہ خیال دل میں آتا تھا کہ وہ منصور کو اور اس کے والدین کو دھوکہ دینے کے بجائے کہیں بھاگ جائے۔ وہ اس خاندان سے دور چلی جائے گی تو اوصاف بیگم کے لئے ان نیک لوگوں کے پاس جانے کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔

وہ انکار میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں بے بے! میں طلاق نہیں لوں گی۔"

"کیوں نہیں لوگی؟"

"طلاق عورت کے لئے بہت بڑی گالی ہے۔ اچھے گھرانوں میں طلاق نہیں ہوا کرتی۔"

"اچھے گھرانوں میں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو اب تک میں چاہتی رہی ہوں۔"

"آخر تم ہماری بربادی کیوں چاہتی ہو؟"

"دیکھو' میں تمہارے اور منصور کے خاندان کی دشمن نہیں ہوں' مجھے صرف اپنے دھندے کے مطابق حسین لڑکیوں سے دلچسپی ہے تم میرے اشاروں پر چلو۔ اپنے اور منصور کے خاندانوں سے رشتے توڑ لو۔ اپنے باپ کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ابو کو مرنے تک سونے کے نوالے کھلاؤں گی۔"

"آپ مجھ سے چاہتی کیا ہیں؟"

"میں تمہیں ملک سے باہر بھیجنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ منصور مجھے جانے کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔"

"جب تمہارے جانے کا وقت آئے گا' اس وقت وہ تمہارا شوہر نہیں رہے گا۔ تم اس سے طلاق لے چکی ہوگی۔"

"اگر میں نہ لوں تو؟"

"تو منصور اور اس کے والدین کو وہ کیسٹ سنا دیا جائے گا۔"

بھولی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اوصاف بیگم نے کہا۔ "ہر حال میں تمہاری بدنامی ہے خواہ طلاق لو نہ لو' البتہ منصور کے گھر والوں کو میرے ہتھکنڈوں سے بچا سکتی ہو۔ شرط یہی ہے کہ طلاق لے لو۔ تم اس خاندان سے نکل جاؤ گی تو ہم اس کے دروازے پر کبھی نہیں جائیں گے۔"

وہ سن رہی تھی اور سر تھام کر سوچ رہی تھی' پھر بولی۔ "بے بے تم طلاق کی بات نہ کرو۔ باقی میں تمہاری ہر بات مان لوں گی۔ میں اس خاندان کے تحفظ کے لئے پھر ایک بار منصور کو دھوکہ دوں گی۔ انہیں چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں گی مگر ایک ذرا گنجائش رکھنا چاہتی ہوں کہ کبھی منصور کو میری مظلومیت کا یقین ہو تو وہ مجھے قبول کرلے۔ طلاق لوں گی تو دوبارہ منصور کے پاس نہیں جاسکوں گی۔"

"تم طلاق نہیں لوگی تو تم پر منصور کا پورا اختیار ہوگا۔ وہ تمہیں ملک سے باہر جانے نہیں دے گا۔ ابھی وقت ہے اچھی طرح اپنا اور اپنے چاہنے والوں کا بھلا برا سوچ لو۔"

وہ کئی ماہ تک پریشان حال سوچتی رہی۔ پھر ایک دن ایک بچی کی ماں بن گئی۔ اُدھر

اوصاف بیگم اس کے باپ ریاست علی کو اس بات پر آمادہ کرنے لگی کہ وہ بیٹی کو طلاق دلا کر باہر بھیج دے۔ ریاست علی نے اسے خوب گالیاں سنائیں جواب میں اوصاف بیگم نے وہ کیسٹ سنا دیا۔ جب اس بوڑھے غیرت مند باپ پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کی بیٹی اعظم کی طرف سے بچی کی ماں بنی ہے تو اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا پھر بھولی نے کئی دنوں تک باپ کی آواز نہیں سنی۔ وہ کسی سے بولتا نہیں تھا۔ ایک باپ ہی جانتا ہے کہ بے غیرتی کے ایسے مقام پر کچھ بولنے کا منہ کیوں نہیں رہتا۔

بھولی نے فیصلہ کن انداز میں اوصاف بیگم سے پوچھا۔ "میں تمہاری ہر بات مان لوں گی مگر اتنا بتا دو کہ تم مجھے ملک سے باہر بھیجنے پر کیوں تل گئی ہو' آخر تمہاری پروین بھی تو ہے۔"

اوصاف بیگم نے جواب دیا۔ "صرف پروین نہیں اور بھی دنیا میں لڑکیاں ہیں لیکن اس محلے میں آتے ہی میں نے تمہیں تاڑ لیا تھا۔ تمہارے حسن اور تمہارے بدن میں ایسی کشش ہے کہ سمندر پار تک تم مقناطیس کا کام کرو گی۔ میں اپنی پروین اور نورین کو باہر بھیجنا چاہتی تھی۔ نورین تو خیر کچھ حسین ہے مگر پروین بھدی نکلی۔ میں نے ایجنٹ کو دونوں کی بڑی سی تصویریں دیں تو اس نے کہا ان سے بھی حسین تصویر دوں گی تو میری بیٹیاں پاس ہوجائیں گی۔ جیسا کہ اونٹ کے گلے میں بلی کو باندھ کر بیچا جاتا ہے' ویسا ہی حساب تھا لہٰذا میں نے تمہاری تصویر ایجنٹ کو دے دی۔" وہ ایک ذرا توقف کے بعد بولی۔ "چھ ماہ کے بعد وہ ایجنٹ آیا اپنے ساتھ ڈیڑھ لاکھ روپے لایا۔ اس نے بتایا کہ تم اول نمبر سے پاس ہوئی ہو۔ دو برس کے لئے جاؤ گی اور پانچ لاکھ روپے کما کر لاؤ گی۔ تمہارے لئے وہ ایک لاکھ روپے پیشگی لایا تھا۔ نورین کو دو سال میں دو لاکھ روپے ملیں گے۔ اس کے لئے پچاس ہزار پیشگی رقم آئی تھی۔ پروین فیل ہوگئی تھی۔"

بھولی حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سودے بازی کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ لڑکیاں باہر جاکر عزت سے اتنی دولت کماتی ہوں گی۔ اوصاف بیگم نے کہا۔ "اس وقت میں ایک لاکھ روپے وصول کرکے تمہیں باہر جانے پر مجبور نہیں کرسکتی تھی کیونکہ صرف تمہاری ایک کمزوری میرے ہاتھ میں تھی کہ تم ناجائز بچے کی ماں بننے

والی تھیں میں تمہارے باپ کو بھی پھانسنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تو کیا نہیں کرسکتی تھی۔ تمہارے ہونے والے بچے کو ضائع کرا سکتی تھی مگر میں نے سوچا کہ بچی پیدا ہوگی تو ہمارے کام آئے گی اور تم نے دیکھا بیٹی ہی پیدا ہوئی۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں نے ایجنٹ سے بہانہ کیا۔ یہ نہیں بتایا کہ تم ماں بننے والی ہو۔ بتا دیتی تو تمہاری ملازمت چلی جاتی کیونکہ ملازمت کے لئے لڑکی کا کنواری ہونا ضروری ہوتا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ ایک برس بعد تم بی اے کا امتحان پاس کرو گی تب باہر جاؤ گی۔ کم از کم ایک برس بعد جاؤ گی۔ اس پر بھی شرط یہ ہے کہ پروین کی ملازمت ہونی چاہئے۔ نہیں ہوگی تو میں بھولی کو نہیں بھیجوں گی۔ سچ پوچھو بھولی! تو مجھے تمہاری ملازمت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس یہی ایڈوانس کے ایک لاکھ مجھے ملیں گے۔ باقی تم وہاں جاؤ گی تو تمہارے پر نکل آئیں گے۔ تم پرائی ہو پرائی رہو گی میں صرف اپنی بیٹیوں کے لئے راستے ہموار کرنا چاہتی ہوں۔ نورین جاچکی ہے تمہارا نمبر اتنا اونچا ہے کہ ایجنٹ تمہاری خاطر پروین کو بھی کام پر لگا دے گا۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر وہاں لے جانا چاہتا ہے۔ تم ایک خوبصورت پل ہو جس پر سے پروین گزر کر جائے گی تو وہاں سے کچھ نہ کچھ کما کر میرے لئے بھیجتی رہے گی۔"

اب بھولی کی سمجھ میں آگیا کہ وہ عورت منصور سے اسے طلاق دلا کر رہے گی اور طلاق نہ لینے کی صورت میں وہ شریف گھرانوں کی عزت کو دور تک اچھال دے گی۔ ایسے ہی وقت منصور سعودی عرب سے واپس آیا اس نے بھولی کو طلاق کے مطالبے سے باز رکھنا چاہا۔ پھر اس نے اپنے سسر ریاست علی سے ملاقات کی لیکن وہ بوڑھا کسی سے بولتا نہیں تھا اور داماد کے سامنے تو کچھ بولنے کا منہ نہیں تھا۔ اچھا ہوا تھا کہ اس نے خود پر سکتے کا عالم طاری کر رکھا تھا۔ بہرحال طلاق ہوگئی۔ بھولی اور منصور کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔

میں نے ڈائری بند کردی۔ مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اوصاف بیگم نے بھولی کے مہر کے پچیس ہزار روپے اس لئے طلب نہیں کئے تھے کہ اسے ایک لاکھ روپے پیشگی کے طور پر ملنے والے تھے' اور بھولی کے سہارے پروین بھی باہر جانے والی تھی۔

منصور نے مجھ سے وہ ڈائری لیتے ہوئے کہا۔ "اب آپ وہ خط پڑھ لیں۔"

وہ لفافہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا خط نکال کر کھولا۔ وہ خط چار صفحات پر مشتمل تھا۔ میں اسے پڑھتے پڑھتے پھر بھولی کے پاس پہنچ گیا۔

بھولی کا پاسپورٹ اور ویزا آگیا تھا۔ اس کے حسن کے طفیل پروین بھی باہر جانے کی تیاریاں کررہی تھی۔ تب ریاست علی کی زبان کھل گئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اس نے اوصاف بیگم سے صلح کرلی۔ بھولی کو اپنے غیرت مند باپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ اس نے اوصاف بیگم کے سامنے بھولی سے کہا۔ "بیٹی! وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کبھی فولادی سلاخیں بھی اپنی اکڑ بھول کر جھک جاتی ہیں یا جھکا دی جاتی ہیں۔ ہم تو پھر گوشت پوست کے انسان ہیں۔"

بھولی اور پروین کی روانگی سے پہلے روزانہ شاپنگ ہوا کرتی تھی۔ بھولی شاپنگ کے لئے جبراً جایا کرتی تھی۔ ایک دن ریاست علی بھی ان کے ساتھ گیا۔ شام تک وہ لوگ بہت مصروف رہے۔ رات کا کھانا انہوں نے اوصاف بیگم کے ہاں کھایا۔ پھر سونے کے وقت دونوں باپ بیٹی اپنے گھر آگئے۔ ریاست علی نے پہلے آنگن کے دروازے کو اندر سے بند کیا' پھر کمرے میں آکر بولا۔ "دو گلاس پانی لے آؤ۔"

بھولی نے حکم کی تعمیل کی۔ دو گلاس پانی لاکر درمیانی میز پر رکھ دیا۔ ریاست علی نے کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "پگلی! میں تیرے دکھ سمجھتا ہوں۔ فکر نہ کر آج ہم اوصاف بیگم کو منہ توڑ جواب دیں گے۔ اس حرام زادی نے شریف آدمی دیکھے ہی کہاں ہیں۔"

وہ میز کے پاس آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹی کو پچکار کر بولا۔ "آؤ بیٹھ جاؤ۔"

وہ اپنے سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔ باپ نے اپنی اوپری جیب سے کاغذ کی ایک پڑیا نکالی' اسے کھولا پھر اس میں جو کچھ تھا اسے دو حصوں میں تقسیم کرکے گلاس میں ڈال دیا۔ بھولی غور سے دیکھ رہی تھی' وہ بولی۔ "میں سمجھ گئی۔ آپ بہت اچھے ہیں ابو! اگر آپ اجازت دیں تو میں منصور کو آخری خط لکھ دوں۔"

باپ نے اجازت دے دی۔ بھولی کاغذ قلم لاکر وہاں بیٹھ گئی۔ پھر لکھنے لگی۔ اس نے

لکھا کہ منصور اپنی پانچ برس پرانی ڈائری اٹھا کر دیکھے اور چھ ستمبر کے صفحے سے اس کی روداد پڑھ لے پھر اس نے لکھا کہ آج وہ باپ بیٹی بہت خوش ہیں۔ بڑی اچھی باتیں کررہے ہیں۔ باتیں کرنے کے بعد وہ ایسا آب حیات پئیں گے جسے پینے کے بعد ایک بیٹی کی عزت اور باپ کی غیرت زندۂ جاوید رہے گی۔

خط لکھنے کے بعد اس نے ڈاک کے لفافہ میں اسے رکھا۔ اس پر منصور کی کوٹھی کا پتہ لکھا۔ پھر ریاست علی وہ لفافہ لے کر باہر گیا۔ محلے میں سڑک کے کنارے ایک لیٹر بکس تھا وہاں اس خط کو پوسٹ کرنے کے بعد وہ واپس آگیا۔ پھر باپ بیٹی آرام سے بیٹھ کر آب حیات پینے لگے۔

"بیٹے! خودکشی گناہ ہے اور آنچل کا تحفظ ثواب ہے۔ صرف ثواب ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیبی غیرت کا تقاضہ ہے۔"

"ابو یہ بہت کڑوا ہے۔"

"میری لاڈلی! زندگی کے ان آخری لمحوں کو ایک سانس میں پی لے۔ زندہ رہے گی تو لوگ گناہ گار سمجھ کر تجھے پتھر ماریں گے تیرے اندر کی حیا اور سچائی کو کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"ابو! یہ اوصاف بیگم سے زیادہ کڑوا نہیں ہے۔"

"باپ کی جان! جان جاتی ہے تو اس لمحہ زندگی کتنی حسین لگتی ہے۔ ہم کس سے شکایت کریں کہ زندگی کا حسن ہمیں نہیں ملا۔ اگر قانون کا تحفظ ہی مل جاتا تو آج یوں بدنامی کا زہر نہ پیتے۔"

بھولی کے ہاتھ سے خالی گلاس چھوٹ کر میز پر گر پڑا۔ وہ جھک گئی۔ فولاد کی سلاخوں کو جھکانے والے سمجھتے ہیں کہ جھکا لیا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ جھک کر بھی فولاد ہی رہتا ہے۔

ریاست علی اپنی کرسی کھسکا کر بیٹی کے پاس آگیا۔ وہ لرز رہی تھی۔ کراہ رہی تھی۔ چہرہ یوں سرخ ہوگیا تھا جیسے اندر سے آخری بار لہو اچھل رہا ہو۔ ریاست علی نے کھینچ کر اسے سینے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اندر سے ٹوٹ ٹوٹ کر کسی کو گالیاں

دینے لگا۔

"حرام زادے نہیں جانتے کہ ہم کفن میں لپٹ کر بھی شرافت کو زندہ رکھتے ہیں۔ کتے کے بچے! ہماری بہو بیٹیوں کے آنچل کو ایکسپوزٹ کرنا چاہتے ہیں۔ تھو ہے تھو............"

بھولی کا کانپتا ہوا ہاتھ باپ کے آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے اٹھا۔ نحیف سی آواز ابھری۔ "ابو! ابو جانی............"

اچانک ہی وہ ہاتھ بے جان ہو کر ڈھلک گیا۔

بھولی کا وہ آخری خط میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے یوں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ جیسے وہ بھولی کا' میری بیٹی کا آنچل ہو۔

☆------☆------☆

آخری اسٹیشن

اس شہر کی دردناک کہانی جہاں زندگی کی بجائے موت سانس لے رہی تھی۔
وہ بہو نہیں' بلا تھی جو اپنے ساتھ موت لے کر آئی تھی۔
شاستا اور ماسٹر دیال کو بھگوان نے نہیں' شیطان نے موت سے بچایا تھا۔
بھوپال کی گیس زیادہ زہریلی تھی یا ہندو حکمران!
آخری اسٹیشن' جہاں سے واپسی کی کوئی ٹرین نہیں چلتی۔

موسم بہار کی شبنمی دھند پورے شہر پر چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا' سفید سفید بادل آسمان کو چھوڑ کر زمین پر اتر آئے ہوں۔ بھوپال جنکشن پر ایک ٹرین سے آنے والے مسافر دوسری سمت جانے کے لئے کسی دوسری ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ مسافر خانے میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہاں جگہ نہ ہونے کے باعث مسافر شیڈ کے نیچے پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی ایک ٹرین آکر رکی تھی۔ ایک کمپارٹمنٹ میں بڑی دھوم دھام تھی۔ لوگ باجے گاجے کے ساتھ دلہن کو اتار رہے تھے۔

دلہن لانبا سا گھونگھٹ نکالے ہوئے تھی' من موہنی سی کھلتی ہوئی کلی جیسی صورت ہوگی جو نظر نہیں آرہی تھی۔ مسافروں کو اپنا اپنا راستہ لینا چاہئے تھا مگر وہ رک گئے تھے۔ دلہن کو دیکھنا چاہتے تھے۔ صورت نظر نہیں آرہی تھی اس لئے اس کے حنائی ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ پردے کے نام پر عورت کو خواہ کتنا ہی چھپایا جائے' مرد اسے ڈھونڈ نکالنے کی کوئی صورت نکال ہی لیتے ہیں۔ کوئی گھونگھٹ والی یا برقع والی سامنے سے گزرتی ہو تو شکاری نظریں پہلے اس کے ہاتھوں کو دیکھتی ہیں۔ ہاتھ گورے ہیں تو وہ حسین ہوگی۔ سانولی ہے تو تیکھے نقوش والی ہوگی۔ ہاتھوں کی پشت پر رگیں ابھری ہوں تو شادی شدہ ہے' بیمار ہے یا بچے والی ہے۔ اگر ہاتھ چکنے اور ملائم ہیں تو ابھی کسی کے قریب نہیں آئی ہے۔ قسمت آزمائی جاسکتی ہے۔ گھونگھٹ یا برقع سنبھالنے کے لئے ہاتھوں کو بے پردہ رکھنا پڑتا ہے۔ ان ہاتھوں کی رنگت اور بناوٹ' انگلیوں کی ساخت' ناخنوں کی رنگت' ان کی قدرتی ساخت' ان کی لمبائی اور تراش خراش کو سمجھنے کے لئے کسی کتاب کو پڑھنا ضروری نہیں ہوتا۔ ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والے مستقبل کا حال بتاتے ہیں۔ پردے کا حال جاننے کے لئے آدمی کا ہوس پرست ہونا کافی ہے۔

ایک عورت نے کہا۔ "رک جاؤ۔ دلہن کو ابھی کمپارٹمنٹ سے نہ اتارو۔ یہ پرائے شہر سے آرہی ہے۔ بھوپال کی زمین پر پہلی بار قدم رکھے گی۔ پہلے اس کے پاؤں دھلاؤ۔"

ایک بوڑھی عورت نے تاکید کی۔ "بھاگ وَتی ٹھیک کہتی ہے۔ پاؤں دھلانے سے نئی جگہ کے دلدر دور ہوجاتے ہیں۔ ساری بلائیں بھاگ جاتی ہیں۔"

ایک بڑے سائز کی پگڑی پہنے ہوئے شخص نے گرج کر کہا۔ "جو کرنا ہے جلدی کرو۔ یہ ریل گاڑی ہمارے باپ کی نہیں ہے۔ اسے آگے بھی جانا ہے۔ ارے او دھرمو! پانی لے آ۔"

دھرمو نے پیتل کے لوٹے میں پانی لیا' ایک ہاتھ سے لوٹا اٹھایا دوسرے ہاتھ سے دھوتی کی لانگ سنبھالتے ہوئے دوڑتے ہوئے کمپارٹمنٹ کے دروازے کے پاس دلہن کے سامنے آیا۔ ایک عورت نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔ "ارے دھرمو! کا دلہن کے پاؤں تو دھلاوے گا؟"

دھرمو نے پیلے پیلے دانتوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں' بڑے مالک نے حکم دیا ہے۔"

وہ اس کے مسکراتے ہوئے منہ پر دو انگلیوں سے ٹھونسا مار کر بولی۔ "یہ بالکل کوری اور کنواری ہے۔ ابھی تک دلہا نے اسے ہاتھ نہیں لگایا اور تو ہاتھ لگانے آیا ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

سب ہنسنے لگے۔ بڑے سائز کی پگڑی والے مالک نے پھر گرج کر کہا۔ "اری او چمپا! کا مجاک ٹھٹھا کرے ہے ری۔ دلہن کو ادھر سے لے جانا ہے کہ نہیں؟"

چمپا نے دھرمو سے پیتل کا لوٹا لیا۔ دو عورتوں نے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر دلہن کی جوتیاں اتاریں اور گیت گاتی ہوئی اس کے پاؤں دھونے لگیں۔ گیت کے بول کچھ یوں تھے۔ "دلہن کسی امیر کے گھر جائے یا غریب کے' سب اسے لکشمی کہتے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں کہ گھر میں دلہن کے قدم رکھتے ہی خوشحالی آجائے گی۔ خوشحالی آجائے تو وہ خوش قدم کہلاتی ہے ورنہ شوہر اور ساس سسر سے لے کر گھر کے کتے تک اس پر غراتے ہیں۔"

دلہن کے پاؤں دھل گئے۔ ایک عورت اسے جوتیاں پہنانا چاہتی تھی' ایک بوڑھی نے ہاتھ سے جوتیاں چھین کر کہا۔ "ان میں بھی جگہ جگہ کی نحوست ہوگی۔ ان کی بھی دھلائی کرو یا دلہن کو ننگے پاؤں ہماری زمین پر اتارو۔"

جوتیوں کی دھلائی ہونے تک دلہا نے دلہن کو دونوں بازوؤں میں اٹھالیا پھر پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "تم سب اس بات کے گواہ رہنا' میں نے دلہن کو اپنی زمین پر قدم رکھنے نہیں دیا پہلے میں نے قدم رکھا ہے۔ جب یہ گھر کی دہلیز پر پہنچے گی تو میں پھر اسے اٹھاؤں گا اور پہلے دہلیز کو خود پار کروں گا تاکہ اسے کوئی خوش قدم ہونے کی مبارک باد اور منحوس ہونے کا طعنہ نہ دے سکے۔ اس کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کو جھیلنے والا میں ہوں کیونکہ میں مرد ہوں۔"

اس نے گھونگھٹ کے قریب سرگوشی میں دلہن سے کچھ کہا پھر اسے آہستہ سے زمین پر کھڑا کردیا۔ اس کے استقبال کو آنے والے اسے بدھائی دے رہے تھے۔ ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "شنکر نے کیا مردوں والی بات کی ہے۔ آخر ایم اے پاس ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ارے جاؤ۔ پہلے ہی دن عورت کو گود میں اٹھا کر یہ جتا دیا ہے کہ جورو کا گلام ہے۔ دیکھ لینا اب یہ ساری جندگانی اس کے سر پر ناچے گی۔"

تیسرے نے تائید کی۔ "ہاں' جیادہ پڑھ لکھ لینے سے آدمی مرد سے چوہا بن جاوے ہے۔ نہیں' چوہے سے تو عورت ڈرے ہے۔ یہ سمجھو مرد بھیگی بلی بن جاوے ہے۔"

وہ کہتے کہتے اچانک لڑکھڑا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے سانس جل رہی ہے۔ ہر آنے جانے والی سانس میں آگ سی لگ رہی ہے۔ اس نے ناک اور منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ گھبرا کر آس پاس کھڑے ہوئے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہاں تنہا اس کی حالت ایسی نہیں تھی۔ دور دور تک لوگوں کا یہی حال تھا۔ بچے چیخ رہے تھے' رو رہے تھے۔ مائیں انہیں آنچلوں میں چھپا رہی تھیں اور خود گرتی پڑتی ہوئی اپنے جگر گوشوں کو سمیٹتی ہوئی زمین پر رینگ رہی تھیں۔ کسی میں کھڑے رہنے کی سکت نہیں تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اچانک کیا ہوگیا ہے؟

کچھ تعلیم یافتہ لوگوں کو گمان ہوا' ہائیڈروجن بم گرایا گیا ہے اس بم کے اثر سے ہوا میں تیزابیت پیدا ہوگئی ہے۔ اسی لئے سانس لیتے وقت ہوا کی جگہ آگ اندر آرہی ہے۔ وہ تازہ ہوا کی جستجو میں تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ جو کمزور دل کے لوگ تھے اور ذرا سی بات میں بدحواس ہوجاتے تھے' ان کے دماغ گویا ہل رہے تھے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ زلزلہ آگیا ہے۔ زمین ہل رہی ہے اور وہ زمین شق ہوکر ان کی قبر بننے والی ہے۔ وہ بھی جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگ رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر حد نظر تک بچوں کی آوازیں مرچکی تھیں اور بوڑھوں کی کراہیں دم توڑ رہی تھیں۔ بچوں کے پھیپھڑے چھوٹے ہوتے ہیں زیادہ سانس نہ لے سکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی سے نکلی ہوئی مچھلیوں کی طرح پھڑ پھڑا کر مرگئے۔

وہ ریلوے اسٹیشن حیاتِ انسانی کا آخری اسٹیشن بن چکا تھا۔ ابھی کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ موت کیسے آرہی ہے اور کہاں سے آرہی ہے؟ آج تک دنیا میں ایسا کوئی وبائی مرض نہیں پھیلا جو دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار انسانوں اور جانوروں کو ایک ہی وقت میں تڑپا تڑپا کر مار ڈالے۔ پلیٹ فارم پر بھٹکنے والے کتے بھی بڑی منحوس اور دردناک آوازیں نکال کر جان سے جارہے تھے۔ دھرمو نے اکھڑی اکھڑی سی سانسوں میں کہا۔ "چمپا! بھاگ چل۔ لگتا ہے' کالی ماتا گجب میں ہے۔ سب کی جان لیوے گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے چمپا کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے دوڑنے لگا۔ چمپا کبھی اپنے بدن کو چھونے نہیں دیتی تھی۔ وہ منگو کمہار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑی ناز نخرے والی تھی۔ دھرمو بڑے مالک کا ادنیٰ ملازم تھا۔ وہ اس کے سامنے سے تھوک کر چلی جاتی تھی۔ اس لمحے اسے دھرمو کے ہاتھ پکڑنے سے بہت بڑا سہارا ملا۔ وہ جیسے ڈوب رہی تھی۔ دھرمو کے دوڑنے سے خیال آیا کہ شاید دوڑتے رہنے سے آگے چل کر ہوا تبدیل ہوجائے۔ سانسوں میں جلن کم ہوجائے اور جاتی ہوئی زندگی واپس آجائے۔ اس سے ہاتھ پکڑنے والا ادنیٰ ملازم نہیں تھا۔ زندگی دینے والا دھرمو تھا۔

بڑے مالک نے جلدی سے اپنی پگڑی نوچ کر ناک اور منہ پر رکھ لی تھی اور اپنے دلہا بیٹے سے یہ کہتے ہوئے بھاگ نکلے تھے۔ "شنکر! میرے ساتھ آ۔ میرے ساتھ بھاگ

میرے بیٹے' یہاں موت ہے موت..........."

پھرانسوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ موت کچھ دیکھنے سمجھنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔ زندگی سمجھا رہی تھی' جو بھی لمحات رہ گئے ہیں' ان میں جان بچانے کی کوشش کرلی جائے۔

دلہن نے جب سے لانبا گھونگھٹ نکالا تھا' تب سے گھٹن محسوس کررہی تھی۔ اسے تازہ ہوا نہیں مل رہی تھی۔ یہ اس کے لئے اچھا ہوا کیونکہ جب زہریلی گیس پلیٹ فارم تک آئی تو لانبے اور گہرے گھونگھٹ کے باعث اس کے نتھنوں میں دیر سے پہنچی۔ اتنی دیر میں اس نے آس پاس کی عورتوں' بچوں اور مردوں کو چیختے چلاتے دوڑتے بھاگتے ہوئے سنا۔ جی میں آیا فوراً گھونگھٹ الٹ کر دیکھے مگرنئی نویلی دلہن تھی لاج آرہی تھی۔ یہ شرم وحیا چند ساعتوں کے لئے تھی۔ اس نے اپنے پتی دیو شنکر کی کراہ سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "پلیز کامنا! کم آوٹ آف یور گھونگھٹ۔ تم ڈاکٹر ہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو' یہاں کیا ہورہا ہے۔"

کامنا کماری لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اس نے گھونگھٹ اٹھاتے ہی میتھائل ایسوسائنیٹ کی بو محسوس کی۔ سامنے ہی پانی سے بھری ہوئی وہ بالٹی تھی جس میں سے دھرمو اس کا پاؤں دھلانے کے لئے ایک لوٹا پانی لے گیا تھا۔ کامنا نے سانس روک لی۔ اپنے رومال کے ایک حصے کو پانی میں بھگویا پھر شنکر کے چہرے پر رکھ کر بولی۔ "بھیگے کپڑے میں سانس لو اور آنکھوں کو ڈھانپ کر رکھو۔"

پھراس نے ساری کا آنچل اچھی طرح بھگویا' اسے اپنے منہ پر رکھا۔ شنکر نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "دیکھو' گاڑی جارہی ہے۔ یہاں سے فرار کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ کم آن۔ ہری اپ........"

وہ دونوں دوڑتے ہوئے کمپارٹمنٹ میں آئے۔ جو لوگ بچ گئے تھے اور موت سے لڑرہے تھے وہ بھی ہانپتے کانپتے ٹرین میں سوار ہو رہے تھے۔ جان بچانے والی وہی ایک ٹرین تھی۔ دوسرے پلیٹ فارم سے بھی لوگ بھاگتے آرہے تھے۔ اس میں سوار ہونے کے لئے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ مار پیٹ کراپنی آخری طاقت کا مظاہرہ کرتے

ہوئے دروازے کے ہینڈل تک پہنچنے کی کوشش کررہے تھے۔ شنکر نے بڑی مشکلوں سے لوگوں کی بھیڑ میں جگہ بنائی۔ کامنا کو پوری قوت سے کمپارٹمنٹ کے اندر کھینچا۔ اس کھینچاتانی میں بھیگا ہوا رومال ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ پھراپنی سانسوں میں زہریلی ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ کامنا دھکے کھاتی ہوئی قریب آئی۔ ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر بھرے مجمع میں ساری کے بھیگے ہوئے آنچل کے سائے میں اس سے لپٹ گئی۔ ہانپتے ہوئے بولی۔ "کسی طرح مجھے ٹائلٹ میں لے چلو' وہاں پانی ہے میں ڈاکٹر ہوں شنکر! دوسروں کی جان بچانا میرا دھرم ہے۔"

انجن کے ڈرائیور نے کبھی ریلوے کے قانون کے خلاف گاڑی نہیں چلائی تھی۔ پہلے اسے لائن کلیئر ملتی تھی' سامنے سگنل ڈاؤن ہوتا تھا' پلیٹ فارم کی گھنٹی بجتی تھی' گارڈ سیٹی بجاتا تھا۔ تب وہ انجن اسٹارٹ کرتا تھا۔ اس رات اس نے موت کو قریب سے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے اخباروں میں پڑھ چکا تھا کہ بھوپال شہر موت کے سائے میں ہے۔ وہاں کے شہری کسی دن بھی زہریلی گیس کا شکار ہوسکتے ہیں۔ یہ باتیں اس کے دماغ میں تھیں اس نے لائن کلیئر ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے باربار سیٹی بجائی تاکہ جو لوگ بچ گئے ہیں وہ سوار ہوسکیں۔ اب وہ اپنے ساتھ جتنی انسانی جانیں بچا سکتا تھا انہیں بچانے کے لئے نہایت تیز رفتاری سے زہریلی فضا سے دور نکل جانے کی کوشش کررہا تھا۔

شنکر کامنا کو ٹائلٹ میں لے آیا تھا۔ وہاں اپنا رومال بھگو کر منہ پر رکھ لیا تھا اور بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔ "بہنو اور بھائیو! ہم آپ کو زہریلی گیس سے مکتی دلا سکتے ہیں۔ آپ اپنا ایک ایک کپڑا ہمیں دیتے جائیں۔"

وہاں کون تھا جو زندگی کا پیغام سن کر اپنے کپڑے نہ اتارتا۔ شنکر نے ایک کپڑا مانگا تھا وہ گھبراہٹ اور بدحواسی میں سارے کپڑے اتار رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "آپ دھیرج سے کام لیں۔ ایک آدمی صرف ایک کپڑا دے۔ بھگوان کے لئے اپنے ہوش میں رہیں پورے کپڑے نہ اتاریں۔"

ذرا سی دیر میں ٹائلٹ کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی۔ کامنا ایک ایک کپڑا بھگو رہی

تھی شنکر انہیں بھیگے ہوئے کپڑے دیتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔ "یہ کپڑا اپنی ناک اور آنکھوں پر رکھ لیں' منہ بند رکھیں پہلے عورتوں اور بچوں کو بھیگے ہوئے کپڑے پہنچائیں۔ جنہیں آرام مل رہا ہو' وہ دوسرے ڈبوں میں جاکر لوگوں کی مدد کریں۔ اپنے اوپر مصیبت جھیل کر دوسروں کی جان بچانا دھرم کرم اور پُن کا کام ہے۔"

تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ سب کو گیلے کپڑے مل گئے تھے۔ یوں بھی وہ ٹرین زہریلی فضا سے دور نکل آئی تھی لیکن ٹرین میں کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں جو زندہ رہ گئے تھے وہ طرح طرح کے عذاب میں مبتلا تھے۔ اس گیس کا فوری اثر پھیپھڑوں اور آنکھوں پر ہوا تھا۔ مسافروں میں بہت کم ایسے تھے جو آنکھیں کھولنے کے قابل تھے' ویسے آنکھیں کھلی تھیں یا تکلیف کی شدت سے بند تھیں' سبھی کی آنکھوں سے پانی بہتا جارہا تھا۔ کھانسنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ کامنا اور شنکر بوگی کے ایک سرے سے دوسرے تک پوچھتے پھر رہے تھے۔ کیا یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟ کسی کے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان ہے؟ کیا دواؤں کی کمپنیوں کے ایجنٹ یہاں موجود ہیں؟

کہیں سے حوصلہ افزا جواب نہیں مل رہا تھا۔ ٹرین تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ وہ زنجیر کھینچ کر دوسری بوگی میں جاکر فوری طبی امداد کا سوال نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ٹرین جتنی جلدی قریبی شہر پہنچتی' اتنی ہی جلدی مسافروں کو طبی امداد مل سکتی تھی۔ کامنا نے ہار چیختا کر اعلان کیا۔ "جن کی آنکھوں میں ناقابلِ برداشت جلن ہو رہی ہے' ان کے لئے اب ایک ہی دوا رہ گئی ہے۔ مسافروں کے پاس کھانا ہوگا۔ کھانے کے ساتھ الگ سے نمک ہوگا۔ وہ منہ میں چٹکی بھر نمک رکھ لیں' جلن کم ہوجائے گی۔"

وہ کمپارٹمنٹ کی ایک دیوار سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ شنکر دیوار پر ہاتھ ٹیک کر اس کے روبرو ہوگیا۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا سے ریشمی بالوں کی لٹیں حسین چہرے سے الجھ رہی تھیں' وہ دلہا ہوکر انہیں سلجھا نہیں سکتا تھا۔ عجیب سہاگ رات آئی تھی' وہ اس کے حسن پر شاعری نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی جوانی کی حرارت طلب کرسکتا تھا۔ تمام جذبوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ کامنا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہم تازہ ہوا میں سانس لے رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں مسافر زندگی اور موت کی

کشمکش میں ہیں.......... ادھر بھوپال میں کیا قیامت ٹوٹ رہی ہوگی۔"

شنکر .... نے بہتی ہوئی آنکھوں کو گیلے رومال سے پونچھا' پھر کامنا سے منہ پھیرلیا تاکہ حسن میں نہ ڈوبے' موت کو یاد کرتا رہے۔ یوں تو موت طرح طرح سے آتی ہے۔ آدمی قتل ہوتا ہے' گاڑی کے نیچے آکر مرتا ہے' کسی کا گلا گھونٹا جاتا ہے' کوئی بیماری سے مرتا ہے' کوئی اچھی حالت میں چپ چاپ دم توڑ دیتا ہے۔ موت دل کی حرکت بند ہونے یا سانس رکنے سے ہوتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے' سانس رک جائے تو موت ہوجاتی ہے۔

بھوپال میں اس کے برعکس تھا۔ وہاں سانس لینے سے موت آرہی تھی۔

اب تک زندگی سانس لیتی رہی تھی۔ پہلی بار وہاں موت سانس لے رہی تھی۔

☆------☆------☆

رات کے گیارہ بجے تھے۔ فیکٹری میں دور دور تک خاموشی تھی۔ انجینئر' سپروائزر اور دوسرے افسران اپنے اپنے دفتروں میں اونگھ رہے تھے۔ یا سونے کی تیاری کررہے تھے۔ انہیں اپنے ورکروں پر بھروسا تھا۔ بے چارے مزدور رات کی ڈیوٹی میں صبح تک جاگ کر اپنے بڑوں کی ذمے داریاں سنبھال لیا کرتے تھے۔

شکیل گیس کی ٹنکی کے پاس ڈیوٹی پر تھا۔ وہ چہرے پر گیس ماسک پہنے ہوئے تھا وہ کبھی کرسی پر بیٹھتا تھا' کبھی ٹہلتا ہوا آکر ٹمپریچر چیک کرتا تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے اس نے دیکھا' ٹمپریچر سو ڈگری سے اوپر جارہا تھا۔ اس ٹنکی میں پینتالیس ٹن میتھائل ایسوسنائیٹ کی گنجائش تھی۔ اس کے برعکس وہ ٹنکی لبالب بھرنے والی تھی۔ اس نے فوراً ہی ایک میکینزم کے ذریعے کنٹرول کرنے کی کوشش کی تاکہ گیس ٹنکی کی حد تک دباؤ میں رہے لیکن وہ ناکام رہا۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر سپروائزر کو اطلاع دی۔ "سر! خطرہ ہے۔ ٹمپریچر ہنڈرڈ سے اوپر چلا گیا ہے۔ ٹنکی بھرتی جارہی ہے۔"

سپروائزر باسکو دیسائی نے ڈانٹ کر کہا۔ "یو فول! کیا تم اناڑی ہو۔ کنٹرولنگ سسٹم کو ہینڈل کرو۔"

"سر! میں اپنی دانست میں سب کچھ کرچکا ہوں' پلیز فوراً آئیے! خطرہ بڑھ رہا ہے۔"

"میں آرہا ہوں۔" سپروائزر باسکو نے رابطہ ختم کیا۔ ایک ہاتھ سے ادھے کو منہ لگا کر

دو چار گھونٹ لئے پھر انجینئر کو خطرے سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد گیس ماسک اٹھا کر پہنتے ہوئے جھنجلا گیا کیونکہ ماسک پہننے کے بعد ناک کے ساتھ منہ بھی چھپ جاتا تھا۔ بوتل کو منہ سے لگا کر پی نہیں سکتا تھا۔ جبکہ پینے میں مزہ آ رہا تھا۔ نشہ ایک رنگین و سنگین دنیا میں اسے پہنچا رہا تھا۔ اس نے شکیل کو زیر لب گالی دی۔ گالی منہ سے نکلتے نکلتے گیس ماسک کے اندر ہی رہ گئی۔

وہ ڈگمگاتا ہوا ٹنکی کے پاس آیا۔ انجینئر ایک افسر کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں بھی اچھی خاصی پیئے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا آدمی پی کر زیادہ ہوشمندی اور توجہ سے فرائض انجام دیتا ہے۔ ایسا خیال رکھنے کے باوجود وہاں مزدوروں کو ڈیوٹی کے وقت پینے کی اجازت نہیں تھی۔

انجینئر نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق گیس کو ٹنکی کی حد تک کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی۔ پھر ایک دم سے گھبرا گیا۔ اس نے گیس ماسک پہنے ہوئے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ منہ سے بول نہیں سکتا تھا۔ اس نے کاغذ پر لکھا۔ ٹنکی میں سوراخ ہو گیا ہے۔ خطرے کا سائرن آن کرو۔ لیکج بند کرنے والے انجینئر اور کاریگروں سے رابطہ کرنا ہو گا۔

یہ پڑھتے ہی سپروائزر اور افسر وہاں سے چلے گئے۔ انجینئر نے پھر ایک کاغذ پر لکھا۔ "شکیل! میں ابھی کاریگروں کو لے کر آتا ہوں۔ تم کنٹرولنگ سسٹم کو ہینڈل کرتے رہو۔"

یہ لکھ کر وہ بھی چلا گیا۔ اس وقت فیکٹری میں ایک سو بیس مزدور تھے۔ خطرے کا سائرن سن کر سب ہی گھبرا گئے۔ کوئی ٹنکی کے پاس جانے کی جرأت نہ کر سکا۔ شکیل تنہا کنٹرولنگ سسٹم کو ہینڈل کر رہا تھا۔ اس کی کوششوں سے اتنا ہوتا تھا کہ گیس ٹنکی میں ذرا نیچے ہوتی تھی پھر تھوڑی دیر بعد کنٹرول سے باہر ہو جاتی تھی۔ وہ سوا بارہ بجے تک جی جان سے کوششیں کرتا رہا۔ کوئی انجینئر اور کاریگر اس لیکج کو بند کرنے نہیں آ رہا تھا۔ آخر بارہ بج کر چھبیس منٹ پر وہ خارج ہونے والی گیس ہوا میں شامل ہو کر فیکٹری کے احاطے سے باہر جانے لگی۔

وہ سفید بادلوں کی صورت میں تھی۔ فیکٹری میں بھگدڑ مچ گئی۔ تمام مزدور اور افسران فیکٹری چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ ان کی نااہلی تھی کہ وہ کبھی سائرن کو بھی چیک نہیں

کرتے تھے۔ خطرے سے آگاہ کرنے والے سائرن میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ آواز بہت دھیمی سی تھی جسے فیکٹری کے لوگ ہی سن سکتے تھے اگر سائرن درست ہوتا تو آس پاس کی آبادی والے نیند سے بیدار ہو جاتے۔ شاید اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لیتے۔ یہ درست ہے' ایک کی نااہلی سے دس کو نقصان پہنچتا ہے' وہاں ہزاروں کو جانی نقصان پہنچنے والا تھا۔

فیکٹری کے احاطے کے باہر سب سے پہلی انسانی آبادی شانتی ٹاؤن ہے۔ یہ مزدوروں' چھوٹے بابوں اور گھروں میں جھاڑو برتن کرنے والی غریب عورتوں کی بستی ہے۔ وہاں آج بھی صرف جھونپڑیاں نظر آتی ہیں۔ ایک آدھ پکا مکان بمشکل کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ اسے عرفِ عام میں جھونپڑ پٹی کہتے ہیں۔

ایک جھونپڑی میں دیال ماسٹر اپنی جوان بیٹی کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک بیوی اور جوان بیٹا بھی تھا جو فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ غریبی اور بیماری نے پہلے بیٹے کو پھر بیوی کو کھا لیا۔ وہ پچھلے پانچ برس سے بیٹی کے ساتھ دن کو جھونپڑی میں رہتے تھے' رات کو کھانے پینے کے بعد باہر آ کر سو جاتے تھے۔ بارش ہو یا کڑکڑاتی سردی ہو' وہ اندر نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ بیٹی جوان تھی' نیند کی حالت میں بے ترتیب ہو جاتی تھی بوڑھے باپ کو شرم آتی تھی اس لئے وہ جھونپڑی کے باہر رات گزارتا تھا۔ کھلے آسمان کو دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑتا تھا اور گڑگڑا کر پوچھتا تھا۔ "ہے بھگوان! بڑے گھروں میں کالی پیلی لڑکیوں کے رشتے کیسے آ جاتے ہیں؟ میری بیٹی ارتھک سندر ہے۔ سب اسے نظر لگاتے ہیں۔ سب اسے اچھی بری نظروں سے دیکھتے ہیں مگر کوئی اس کا ہاتھ مانگنے نہیں آتا۔ میں کب تک اسے بری نظروں سے بچاؤں گا۔ ہے بھگوان! میری شانتا کو ڈولی میں بٹھا دے یا اٹھا ہی لے۔ میں اس بڑھاپے میں عزت سے مرنا چاہتا ہوں۔"

ماسٹر دیال اسکول میں پڑھاتے تھے۔ صبح نو بجے سے دوپہر دو بجے تک شانتا سے دور رہتے تھے۔ اسکول جانے سے پہلے اچھی طرح سمجھاتے تھے۔ "دیکھ' میں نے باہر کا سارا کام کر دیا ہے۔ تیری خاطر رات کو کپڑے دھوتا ہوں' وہ صبح نو بجے تک سوکھ جاتے ہیں۔ یہ لے کپڑے' تجھے کپڑا اٹھانے کے لئے بھی باہر نہیں جانا ہو گا۔ دروازہ اندر سے بند

کرلے۔ کسی بندر بھالو والے کو دیکھے گی تو لوگ بدنام کریں گے کہ دیال ماسٹر کی بیٹی تاک جھانک کرتی ہے۔"

وہ گھر سے نکل کر آس پاس کی جھگیوں میں آواز دیتے تھے۔ "مائی کلثوم! اری او درگا بہن! میں اسکول جارہا ہوں' میری بٹیا کا خیال رکھنا۔"

یہ روز کا دستور تھا۔ آدمی ہر روز ایک ہی کام اور ایک ہی ذمے داری سے بیزار ہوجاتا ہے۔ جوان لڑکیوں کے والدین بیزار نہیں ہوتے۔ البتہ پریشان ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے دن گزرتے ہیں' پریشانی خوف میں بدلتی ہے۔ بھوکوں کی بستی میں پکی ہوئی ہانڈی کے پاس نہ بیٹھو تو کوئی بھی اٹھا کر لے جاتا ہے' وہ کسی کے بھی منہ تک پہنچ سکتی ہے۔ اس بستی میں غنڈے موالی آتے جاتے تھے' ایسے لوگ شراب اور شباب کو دور سے سونگھ لیتے تھے۔ پکی چار دیواری میں گھس کر ڈاکے ڈالتے ہیں' جھونپڑی کی کچی دیوار ان کے سامنے کیا ٹھہر سکتی ہے۔

ایک دن دیال ماسٹر نے سنا رام اوتار کی جوان بہن بھری دوپہر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ انہوں نے رام اوتار کے ہاں جاکر دیکھا بات سچ نکلی۔ تب سے دل میں دھڑکا بیٹھ گیا' وہ دن کو اسکول جاتے تھے اور دن کو بھی عزت چلی جاتی ہے' یہ بات اب پریشان کررہی تھی۔ وہ اسکول کی نوکری چھوڑ نہیں سکتے تھے' وہاں کی تنخواہ سے کبھی دو وقت کھاتے تھے کبھی ایک وقت فاقہ کرتے تھے۔ وہ ملازمت چھوڑ کر بیٹی کو فاقوں سے مرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک روز انہوں نے اسکول میں ایک گھنٹا پڑھایا پھر چھٹی لے کر گھر کی طرف چل پڑے۔ دل میں بات آئی تھی کہ صرف راتوں کو پہرا دینے سے عزت محفوظ نہیں رہے گی کبھی کبھی دن کو بھی گھر کا خیال رکھنا چاہئے۔ وہ بستی میں آئے' دور ہی سے دیکھا ان کی جھونپڑی کا دروازہ بند تھا۔ وہ بند دروازہ کہہ رہا تھا' بیٹی باپ کی ہدایات پر عمل کرتی ہے۔ انہوں نے اطمینان کی سانس لی گھر کی طرف بڑھنے سے پہلے سوچنے لگے۔ اسکول میں جھوٹ بول کر چھٹی لی کہ بیٹی بیمار ہے۔ بیٹی سے جھوٹ بولنا ہوگا کہ میں بیمار ہوں' سر میں بہت درد ہے۔ یہ حالات مجھ جیسے اسکول ماسٹر کو بھی جھوٹ بولنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

وہ ایک قدم آگے بڑھے پھر رک گئے۔ انہیں رگھوناتھ دکھائی دیا۔ وہ چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ ایک بار جیل جاچکا تھا۔ رگھو ان کی گلی میں داخل ہوا اور ٹھیک ان کی جھونپڑی کے سامنے رک گیا۔ اب وہ دروازے کی طرف منہ کرکے کچھ کہہ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ اپنی بیٹی شانتا کو دیکھ کر دیال کے دل پر زوردار گھونسا لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ اس بدمعاش سے راضی ہے۔

آنکھوں سے دیکھ کر بھی دیال ماسٹر کا دل نہیں مانتا تھا۔ ماں باپ اپنی اولاد کو جوانی میں معصوم سمجھتے ہیں۔ سامنے والی جھونپڑی میں درگا بہن رہتی تھی' وہ کہیں باہر سے آرہی تھی۔ اس نے ایک نظر رگھو اور شانتا پر ڈالی پھر نظریں چرا کر اپنی جھونپڑی میں چلی گئی۔ ماسٹر کو یقین نہیں آرہا تھا' جس درگا کو وہ بہن کہتے تھے' وہ رگھو بدمعاش کو شانتا کے لئے ڈھیل دے رہی تھی۔

ادھر رگھو نے ہاتھ بڑھا کر شانتا کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس نے دروازہ بند کرلیا' اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ رگھو دونوں ہاتھ جوڑ کر کچھ کہہ رہا تھا' شاید خوشامد کررہا تھا۔ شانتا نے دروازہ کھول کر اسے تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھائی۔ جس کے جواب میں رگھو نے اپنے کان پکڑ لئے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

دیال ماسٹر تیزی سے چلتے ہوئے قریب آئے باپ کو دیکھتے ہی بیٹی کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کرلیا۔ رگھو نے مسکرا کر دیال ماسٹر کو دیکھا۔ پھر جیب سے ریشمی رومال نکال کر اکڑی ہوئی گردن سے باندھتے ہوئے لوفروں کی طرح کہا۔ "جے رام جی کی ماسٹر! تیرے سے ملنے کو آیا تھا۔ تیری چھوکری نے بتایا' یہ تیرا اسکول میں رہنے کا ٹیم ہے۔ میں ادھر ملنے کو جانے والا تھا۔"

ماسٹر غصے سے تھرتھراتے ہوئے اسے گھور کر دیکھ رہے تھے اس پر گرم نہیں ہوسکتے تھے۔ بیٹی کو تماشا نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے دانت پیس کر پوچھا۔ "مجھ سے کیوں ملنے آیا تھا؟"

وہ ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے بولا۔ "ماسٹر! میں جیادہ گھما پھرا کے نہیں

بولتا۔ ساپھ سیدھی بات بولتا ہوں۔ میرے کو تیری چھوکری پسند ہے۔ میں شادی کر کے بمبئی لے جانا مانگتا ہوں۔"

ماسٹر نے چھڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "غنڈے موالی! تیری اتنی ہمت ہوگئی' میرے دروازے پر آکر میری بیٹی کی بات کرتا ہے! میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ میں اسکول ماسٹر ہوں' عزت دار ہوں۔ تجھ جیسے غنڈے کی پرچھائیں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

دیال ماسٹر غصے میں جیسے پاگل ہوگئے تھے۔ اسے چھڑی سے مار رہے تھے اور وہ ہنس رہا تھا۔ آس پاس کی جھگیوں سے مرد' عورتیں اور بچے نکل کر یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ جنون کی حالت میں جیسے سانس لئے بغیر مارتے ہی جا رہے تھے اور اپنی دانست میں زور زور سے پٹائی کر رہے تھے ادھر وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "دیکھو بھائی دیکھو' ماسٹر پاگل ہوگیا ہے گھر میں جوان بیٹی رکھتا ہے کوئی رشتہ مانگنے آئے تو اسکول کا بچہ سمجھ کر لکڑی ڈنڈے سے مارتا ہے۔"

وہ مارتے مارتے تھک گئے۔ چھڑی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ رگھو نے کہا۔ "یہ دنیا والے میرے کو سریپھ اور تیرے کو بدمعاش بولیں گے کیونکہ تو مارتا تھا۔ میں چپ چاپ مار کھاتا تھا۔ اب تو مان لے' تیرے ہونے والے داماد کا باڈی لوہے کے جیسا مجبوط ہے' تیری چھوکری مجے میں رہے گی۔"

"بھاگ جا یہاں سے۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا یا تجھے مار ڈالوں گا۔" وہ اِدھر اُدھر تلاش کر کے۔ جھک جھک کر پتھر اٹھانے اور اسے مارنے لگے۔ وہ پلٹ کر گلی میں جاتے ہوئے کہنے لگا۔ "سالا پاگل کا بچہ ہے۔ بستی والو! تم لوگ اس کو ماسٹر بولتے ہو؟ بولتے ہو تو بولو مگر میرے کو بھی مرد کا بچہ بولو۔ اِدھر سیدھی طرح آیا سیدھی طرح جا رہا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ اس گلی میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ مرد' عورتیں' بچے دیال ماسٹر کو تک رہے تھے۔ وہ بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ "تم سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ بدمعاش میرے دروازے پر آیا تھا' کل تمہارے دروازے پر بھی آسکتا ہے۔ کیا تمہارے ہاں جوان بیٹیاں نہیں ہیں؟"

سب نے سر جھکا لیا۔ کچھ عورتیں اپنے اپنے مردوں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے

جھونپڑیوں کے اندر چلی گئیں۔ ماسٹر نے کہا۔ "مجھے دیکھو' میرے حالات کو سمجھو' میری بات سمجھو۔ ہم غریب ہیں۔ ہمارے پاس عزت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہمیں پیٹ بھرنے کو پوری روٹی نہیں ملتی' تن ڈھانپنے کو پورا کپڑا نہیں ملتا۔ سر چھپانے کو جھونپڑی کی کمزور چھت ملتی ہے مگر ہماری عزت کو تو کمزور نہیں پڑنا چاہئے۔"

انہوں نے درگا کو دیکھ کر کہا۔ "میں تمہیں بہن کہتا تھا۔ روز اسکول جانے سے پہلے التجا کرتا تھا میری بٹیا کا خیال رکھنا۔ تم اپنے دھرم سے کہنا کیا تم نے اس بدمعاش کو میرے دروازے پر آنے سے روکا تھا؟"

درگا نے کہا۔ "معاف کرنا بھیا! میرے گھر میں بھی جوان بیٹی ہے۔ میں اس بدمعاش کا راستہ کاٹنا چاہتی تو وہ ادھر چلا آتا۔ میں تمہارے گھر کا دروازہ بند رکھنے کے لئے اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھول سکتی۔ مجھے بہن بنا کر الٹی عقل نہ سکھاؤ۔"

وہ تنتناتی ہوئی اپنی جھونپڑی میں گئی پھر ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر لیا۔ ماسٹر نے یہاں سے وہاں تک دیکھا۔ سب اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے تھے۔ دروازے بند ہو رہے تھے۔ یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ کمزور لوگوں میں اور کمزور محلوں میں اپنے اپنے دروازے کو مضبوط رکھنے کے لئے کسی ایک آدمی کے دروازے کو کمزور چھوڑا جاتا ہے تاکہ ساری گندگی اُدھر جائے' باقی گھر محفوظ رہیں۔

انہوں نے جھک کر چھڑی اٹھائی' اسے ٹیکتے ہوئے اپنے گھر کے کمزور دروازے پر آئے۔ سوچنے لگے۔ بیٹی سے آنکھ ملاؤں گا تو شرم آئے گی کیا اسے بھی شرم آئے گی؟

انہوں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ شکستہ دیواروں کا ایک ہی کمرا تھا۔ شانتا نے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ساڑھی باندھ دی تھی۔ ساڑھی کے اس پار پردے میں کھڑی تھی۔ باپ سے نظریں نہیں ملانا چاہتی تھی۔

باپ نے بڑے کرب سے کہا۔ "بیٹی! آج میری کمر اور جھک گئی ہے۔ اگر اس پردے کا مطلب یہ ہے کہ تم شرمندہ ہو تو میں اور شرمندہ نہیں کروں گا۔ مجھے پورا بھروسا ہے' میری بیٹی پھر کبھی اس کے لئے دروازہ نہیں کھولے گی۔"

وہ سر جھکا کر جانے لگا لیکن دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ شانتا کہہ رہی تھی۔ "میں

دروازے کے ادھر کبھی نہیں گئی' نہ ادھر کسی کو آنے دیا مگر باپو! کب تک؟"

دیال ماسٹر چونک گئے۔ بیٹی نے بہت چھوٹا سا سوال کیا تھا۔ کب تک؟ اس سوال کے پیچھے بہت سی ناقابلِ انکار حقیقتیں چھپی ہوئی تھیں۔ پہلی حقیقت یہ تھی کہ وہ تیس برس کی ہو چکی تھی۔ جب وہ چودہ برس کی تھی تب سے لڑکا تلاش کیا جا رہا تھا۔ جب وہ پچیس برس کی ہوئی تو ماں تھک ہار کر مر گئی۔ اس کے بعد اور پانچ برس گزر گئے۔ آخر کب تک؟

دوسری حقیقت یہ کہ اس عرصے میں بستی کی چار لڑکیاں کسی نہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھیں' کتنی ہی لڑکیاں اپنے گھروں میں کسی نہ کسی کے ساتھ پکڑی گئی تھیں۔ شانتا نے آج تک پکڑے جانے کا کام نہیں کیا تھا لیکن کب تک؟

باپ برآمدے میں چھجے کے نیچے سوتا تھا۔ بارش کی بوچھاڑ میں بھیگتا تھا۔ سردی کے موسم میں ٹھٹھرتا رہتا تھا اور بیٹی بڑے دکھ سے پوچھتی تھی۔ ایسا کب تک ہو گا؟

باپ کے ہاتھوں میں کب تک' توانائی رہ سکتی ہے؟ وہ دشمن کو کمزور ہاتھوں سے کب تک مار سکتا ہے؟ آخر تھک گیا تھا۔ چھڑی ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

وقت کا پورا پورا حساب رکھنا چاہئے کہ کوئی سا بھی کام کب تک ہو سکتا ہے۔ جب ماں باپ لڑکا تلاش کرتے کرتے ہار جاتے ہیں اور وقت "کب تک" سے آگے نکل جاتا ہے تو لڑکیاں گھر کی دہلیز پھلانگ کر کسی کے ساتھ بھی نکل بھاگتی ہیں خواہ وہ رگھو بدمعاش ہی کیوں نہ ہو۔

دیال ماسٹر چھڑی ٹیکتے ہوئے باہر آ گئے۔ بیٹی کے سوال میں چیلنج تھا کہ وہ بہکتے بھڑکتے جذبوں کے ہجوم میں کب تک رگھو کا راستہ روکے گی؟ یہ تو باپ روک سکتا ہے' ایک داماد لا کر یا رگھو کو بستی سے نکال کر۔

وہ باہر آ کر بولے۔ "بیٹی! دروازہ بند کر لے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے گلی سے گزرنے لگے۔ سر اٹھا کر دائیں بائیں یوں دیکھتے ہوئے جانے لگے جیسے لڑکا ڈھونڈ رہے ہوں۔ اس گلی میں شانتی ٹاؤن کی پوری بستی میں کوئی تو لڑکا ہو گا۔ پھر پورا بھوپال قدموں تلے تھا۔ یہاں سے وہاں تک پورا ہندوستان تھا۔ اسکول

ماسٹر کی ایک ہی بیٹی کے لئے پورے ہندوستان میں ایک لڑکا نہیں مل سکتا تھا۔ اس کے لئے چلتے رہنے کی ضرورت تھی۔ وہ سوچ رہے تھے' اب زندگی کے باقی دن چلتے رہیں گے۔ یہاں کوئی لڑکا نہ ملا تو بیٹی کو ساتھ لے کر داماد یاترا کے لئے پورے ہندوستان کی دھرتی پر چلیں گے۔ ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ ایک داماد نہ ملے! ضرور ملے گا۔

وہ سیدھے تھانے آئے۔ پہلے رگھو کا راستہ روکنا ضروری تھا۔ تھانیدار انہیں دیکھتے ہی کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا۔ آگے بڑھتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "نمستے ماسٹر جی! آپ نے یہاں آنے کا کشٹ کیا۔ مجھے حکم دیتے میں چلا آتا۔ بلکہ آنے ہی والا تھا۔ ابھی وہ رگھو بدمعاش آیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے اسے خوب مارا ہے اور وہ چپ چاپ مار کھاتا رہا ہے؟"

تھانیدار نے ایک کرسی کھینچ کر انہیں بڑے ادب سے بٹھایا وہ بولے۔ "میں نے اسے چھڑی سے مارا ہے۔ میرے بوڑھے ہاتھوں میں اور شکتی ہوتی تو اور مارتا۔ وہ لفنگا میری بیٹی کا رشتہ مانگنے آیا تھا۔"

تھانیدار نے کہا۔ "یہی سوال میں نے رگھو سے کیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ کسی بھی گھر میں جوان لڑکی ہو تو اس کا رشتہ مانگنے اچھے بھی آتے ہیں برے بھی آتے ہیں۔ رگھو چاہے کتنا ہی برا ہو' قانون کے مطابق اور دھرم کے انوسار وہ آپ کے دروازے پر آ کر رشتہ مانگنے کا حق رکھتا ہے۔ آپ تو مہان ہیں ماسٹر جی۔ ہم نے آپ سے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا ہے۔ ہم آپ کو کیا سمجھائیں۔ برے کے ساتھ آپ کو برا سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے انکار کر دیتے۔ وہ بدمعاشی پر آتا تو میں اسے حوالات میں بند کر دیتا مگر یہ کہتے ہوئے اچھا نہیں لگتا کہ آپ نے قانون کو ہاتھ میں لیا ہے۔"

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر سر ہلا کر بولے۔ "غصے میں بھول ہو گئی ہے۔ میں بھول گیا تھا کہ ایک اسکول ماسٹر بھی ہوں۔ اس سے غصے میں صرف لڑکی کا باپ رہ گیا تھا۔ مجھے آنکھوں کے سامنے ایک کتا دکھائی دے رہا تھا جو میری بچی کو کاٹنے آیا تھا میں کتے کو مار رہا تھا رگھو کو نہیں۔ پھر بھی میں اپنی بھول سویکار کرتا ہوں۔"

وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ تھانیدار نے ان کے شانے پر تھپکتے ہوئے کہا۔ "ماسٹرجی' حوصلہ رکھئے۔ آپ کو ہمت نہیں ہارنا چاہئے۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔ "مجھے ہمت نہیں ہارنا چاہئے مگر کب تک؟ حوصلہ رکھنے کے لئے میری کتنی عمر رہ گئی ہے؟ آج یا کل میری آنکھ بند ہوجائے تو تم کہہ سکو گے کہ ہمت نہیں ہارنا چاہئے؟ آخر ہمت نہ ہارنے کی ایک مدت ہوتی ہے۔ یہ مجھے سمجھا دو' کب تک حوصلہ رکھنا چاہئے؟"

"میں آپ کے گمبھیر مسئلے کو سمجھتا ہوں۔ شانتا میری بہن ہے میں اس کے لئے کوئی لڑکا ڈھونڈ نہ سکا۔ عزت دار ماسٹر کی بیٹی کے لئے جس عزت دار لڑکے پر نظر پڑتی ہے' وہ دہیج مانگتا ہے' شانتی ٹاؤن کی جھونپڑپٹی کا نام سن کر منہ بناتا ہے۔"

دیال ماسٹر نے پوچھا۔ "آج تم میری بیٹی کو بہن کیوں کہہ رہے ہو؟"

تھانیدار نے اپنی کرسی پر جاکر بیٹھنے کے بہانے منہ پھیر لیا پھر کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "پتا نہیں' آپ صبح سے شام تک کتنے لڑکے دیکھتے ہیں اور کتنوں سے آس لگاتے ہیں۔ میں اپنی بات صاف کردوں میرا رشتہ انسپکٹر جنرل آف پولیس کی بیٹی سے ہوچکا ہے۔ آئی جی صاحب مجھے بہت مانتے ہیں۔"

ماسٹر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مبارک ہو بیٹے۔ شادی کے بعد فوراً ترقی ہوگی۔ انسپکٹر سے ڈی ایس پی پھر ایس پی بنو گے۔ اب تو ترقی تمہارا مقدر بن گئی۔ ایک دن تم اپنے سسر آئی جی صاحب کی کرسی پر جا بیٹھو گے۔ میں تمہیں طعنے نہیں دے رہا ہوں۔ زندگی میں بڑے سے بڑا چانس لینا ہرجوان لڑکے کا حق ہے تم یہ چانس نہ لیتے تو کوئی اور لے لیتا۔ پتا نہیں' آئی جی صاحب کے ہاں رشتہ مانگنے والوں کی کتنی بھیڑ ہوگی۔ پتا نہیں' یہ چند لڑکیوں والے کس طرح عزت و آبرو کے ساتھ لڑکوں کا بازار لگاتے ہیں۔ خوش رہو بیٹے خوش رہو۔"

وہ چھڑی ٹیک کر جانے لگے۔ اس نے کہا۔ "ماسٹرجی! میں نے رگھو کو وارننگ دی ہے وہ پھر آپ کے دروازے پر نہیں آئے گا۔"

"تمہاری مہربانی ہے بیٹے! میں بھی یہی چاہتا ہوں' میرے ہاں اچھا نہ آئے تو برا بھی

نہ آئے۔"

وہ تھانے سے باہر آکر ہانپنے لگے جیسے صدیوں سے چلتے آرہے ہوں۔ ابھی تو انہوں نے ایک کونا دیکھا تھا جبکہ پورا ہندوستان دیکھنا باقی تھا۔ پتا نہیں' وہ اور کس قدر ہانپنے اور کتنی بار تھک کر گرنے والے تھے۔

رگھو فیکٹری کی دیوار سے ٹیک لگائے چرس کا دم لگا رہا تھا۔ اس کے چار حواری زمین پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ اس نے ماسٹر کو آتے دیکھ کر ایک حواری سے پوچھا۔

"اے او چھیدی لال! سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو کیا کرتے ہیں؟"

چھیدی لال نے پتے پھینٹتے ہوئے کہا۔ "انگلی ٹیڑھی کرلیتے ہیں۔"

رگھو نے ایک کش لے کر پوچھا۔ "کوئی چیز مانگنے سے نہ ملے تو کیا کرتے ہیں؟"

جواب ملا۔ "چھین لیتے ہیں۔"

دیال ماسٹر سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس نے چرس کا دھواں ان کی طرف چھوڑتے ہوئے کہا۔ "کیا چھوکری ہے باپ! پٹاخا ہے پٹاخا جدھر سے پکڑو' ادھر سے جوانی ٹھاں ٹھاں بولے گی۔ ماں کسم' اسے نہ اڑایا تو رگھو نام نہیں.........."

وہ بول رہا تھا۔ ماسٹر کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں' وہ تیز قدم بڑھاتے ہوئے اس سے دور ہو رہے تھے۔ غصہ برداشت کررہے تھے۔ خود کو سمجھا رہے تھے۔ اسے پتھر ماروں گا تو دنیا مجھے پاگل کہے گی۔ بھگوان! یہ کیسی گندی گندی باتیں کررہا ہے۔ میری بیٹی میرے لئے گالی بن رہی ہے۔ یہ جہاں بھی ملے گا ایسے ہی بولتا رہے گا میں کب تک گالی سنتا رہوں گا۔"

وہ گھر جانے والے تھے۔ راستہ بدل کر اسکول کے احاطے میں آگئے۔ بچوں کی چھٹی ہونے والی تھی۔ وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں آئے' اس نے دیکھتے ہی پوچھا۔ "دیال جی' خیریت تو ہے۔ بیٹی بیمار ہے' آپ چھٹی لے کر گئے تھے پھر واپس آگئے؟"

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "بہت لمبی بیماری ہے۔ جب سے وہ سولہ برس کی ہوئی تب سے بیماری بڑھتی جارہی ہے۔ میرا کھانا پینا اور سونا حرام ہوگیا ہے۔"

"کس ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے؟"

"علاج تو ہے' ڈاکٹر نہیں ہے۔ یہاں میری بیٹی کے نصیب میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے میں اسے باہر لے جانا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے دوسرے شہر میں اس کے نصیب سے کوئی مل جائے اور ملنے میں نہ جانے کتنا وقت لگے۔ میں نوکری چھوڑ کر اپنی جمع پونجی لے کر جانا چاہتا ہوں۔"

"دیال جی' آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمارے بھوپال میں ایک سے ایک ڈاکٹر پڑا ہے۔"

"وہ سب بیوی بچوں والے ہیں۔"

"آں؟" ہیڈ ماسٹر نے انہیں چونک کر دیکھا۔ انہوں نے کہا۔ "شانتا تیس برس کی ہو رہی ہے۔ سولہ برس سے حساب کیجئے' وہ باپ کے دماغ کا پھوڑا بن گئی ہے۔ اگر اس کی زندگی میں کوئی ڈاکٹر آتا تو وہ پھنسی سے پھوڑا نہ بنتی۔"

ہیڈ ماسٹر نے سر جھکا کر کہا۔ "اوہ سمجھا۔ آپ کی پریشانی آج کے ہر ماں باپ کی پریشانی ہے مگر میں آپ کو اسکول چھوڑنے نہیں دوں گا جو آپ کی جمع پونجی ہے وہ ایک دن بیٹی کی شادی کے لئے کام آئے گی۔ آپ ایک ماہ کی تنخواہ لے کر شانتا کو اس کے ننھیال لے جائیں۔ بھگوان نے چاہا تو وہاں اس کا رشتہ آجائے گا۔"

دیال ماسٹر نے سر جھکا کر سوچا۔ رگھو سے بچانے کا یہی راستہ ہے اسے کچھ دنوں کے لئے کیرماما کے گھر چھوڑ دینا چاہئے وہ اپنے ماموں اور نانی کے سائے میں رہے گی' میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر دن رات لڑکا تلاش کروں گا۔ جتنے احباب اور شناسا ایک اسکول ماسٹر کی حیثیت سے میری عزت کرتے ہیں' میں ان سب کے گھر جاؤں گا ان سے ہاتھ جوڑ کر کہوں گا اگر ان کے گھر میں لڑکا نہیں ہے تو شانتا کو اپنی بیٹی سمجھ کر وہ بھی لڑکا ڈھونڈنے نکل پڑیں۔ ایک داماد کے لئے اجتماعی طور پر مہم چلانے کی ضرورت ہے۔"

وہ اٹھ کر جانے لگے۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "دیال جی! ہم سب ماسٹر ہیں بچوں کو سچ بولنے کی تعلیم دیتے ہیں مگر میں آپ سے ایک جھوٹ بولنے کی التجا کرتا ہوں۔"

"جھوٹ؟ کیسا جھوٹ؟"

"میں نے شانتا کو ابھی کچھ دن پہلے دیکھا ہے۔ وہ تیس برس کی نہیں لگتی آپ دس

برس کم کر دیں اور گھر جا کر دیکھیں' وہ بیس برس کی دکھائی دے گی۔"

ماسٹر نے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "ہاں' ذرا سوچئے' آپ بیٹی کی عمر بتا کر رشتے بلاتے نہیں' بھگاتے ہیں۔ ہم سچ کی تعلیم دینے والے آج بھی سچے ہیں' کل بھی سچے رہیں گے لیکن ایک بد نصیب کے نصیب سنوارنے کے لئے جھوٹ بولنا پاپ نہیں ہے اگر ہے تو آپ پاپی بن کر بیٹی کے لئے پُن کریں۔"

وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے اور سوچتے ہوئے اسکول سے باہر آئے۔ اتنا بڑا جھوٹ حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ ایک بنیا بھی تولنے میں دس سیر کم نہیں کرتا بلکہ دس چھٹانک بھی کم تولے تو پکڑا جاتا ہے۔ میں دس برس کم کر کے بیٹی کو مذاق بنا دوں گا' بھلا کون یقین کرے گا میں حساب سکھانے والا ماسٹر ہوں۔ اچھی طرح سمجھتا ہوں' تیس کا ہندسہ کبھی بیس کا ہندسہ نہیں بن سکتا۔

وہ چلتے چلتے رک گئے۔ مین روڈ کے چوراہے پر ایک فلم کا بڑا سا بینر لگا ہوا تھا۔ ریکھا اور ہیما مالنی بڑی توبہ شکن اداؤں کے ساتھ نظر آرہی تھیں۔ دیال ماسٹر بیس برس پہلے فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ اسکول میں ماسٹر ہوئے تو سینما گھر کی طرف جانا چھوڑ دیا کیونکہ شاگردوں پر اس کا اچھا اثر نہیں پڑتا۔ انہوں نے سوچا۔ کتنے تعجب کی بات ہے میں نے بیس برس پہلے ریکھا اور ہیما مالنی کو دیکھا تھا۔ وہ تب بھی سولہ برس کی ہیروئنیں تھیں' آج بھی الھڑ کنواری دوشیزاؤں کے روپ میں آتی ہیں۔ کیا ان کی عمریں آگے نہیں بڑھتیں؟"

انہوں نے سر اٹھا کر غور سے بینر کو دیکھا پھر آگے بڑھتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے دس برس کم کرنے کو کہا۔ یہ دونوں بیس برس کم کر چکی ہیں۔ آج بھی سارا ہندوستان انہیں کنواری اور کم سن مانتا ہے۔ اسی ہندوستان میں میری بیٹی رہتی ہے۔ میں اگر دس برس کم کر دوں تو لوگ ضرور مان لیں گے۔ ہیڈ ماسٹر نے بڑے تجربے کی بات سمجھائی ہے۔"

انہیں ایسی مسرتوں کا احساس ہوا جیسے وہ ہاری ہوئی بازی جیتنے والے ہوں دراصل وہ ماسٹری کرتے آئے تھے۔ ماسٹر بن کر سچ بول دیتے تھے۔ پہلے ہی قصائی بن کر دو دن کے

باسی گوشت کو قسم کھا کر تازہ کہہ دیتے تو عقل کے اندھے اسے تازہ سمجھ کر لے جاتے۔ اس بات کو صرف وہ اور ان کی سورگ باشی دھرم پتنی جانتے تھے کہ میاں بیوی کی جذباتی فیکٹری میں شانتا کس تاریخ‘ کس ماہ اور کس سال میں تیار ہوئی تھی۔ دوسرا کوئی صحیح تاریخ نہیں جانتا تھا۔ شانتا کی پیشانی پر مینوفیکچرنگ ڈیٹ کی مہر نہیں لگی تھی۔ ایک باپ جو تاریخ پیدائش بتائے گا‘ وہی دنیا کو ماننا ہوگی۔

وہ بڑے مطمئن‘ بڑے آسودہ سے ہو کر جھونپڑی کے دروازے پر آئے۔ آواز دی۔ ”بیٹی دروازہ کھولو۔“

اگر دروازہ کھلا بھی ہوتا تو وہ دور سے کھانستے کھنکارتے آتے تھے تاکہ وہ ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹی ہو تو اٹھ کر بیٹھ جائے‘ بدن کے کپڑے درست کرلے۔ شانتا نے دروازہ کھولا۔ انہوں نے وہیں کھڑے ہی کھڑے پہلی بار اسے پوری توجہ سے دیکھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور تازگی روزِ اول جیسی تھی۔ جو لڑکیاں بہکتی بھٹکتی ہیں‘ کسی سے یاری کرتی ہیں‘ کچی پکی باتیں کرتی ہیں‘ ان کے چہروں پر پکا پن آجاتا ہے۔ وہ بدن سے بھی سخت اور پکی لگتی ہیں۔ شانتا صحت مند تھی مگر نازک اور کومل سی تھی۔ اس کے چہرے پر نور تھا۔ وہ ایسی گیتا اور رامائن تھی جسے صرف باپ کی مقدس نگاہیں پڑھتی آئی تھیں۔ ابھی وہ جذباتی ناول کی طرح بازاری نگاہوں کی سان پر نہیں چڑھی تھی۔ اسی لئے صاف وشفاف اور تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔

”باپو! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ اندر آجاؤ۔“

وہ چونک گئے۔ جلدی سے اندر آگئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے بولے۔ ”بیٹی! میں نے تمہیں ہمیشہ سچ بولنا سکھایا ہے۔ اگر جھوٹ بولنے کو کہوں تو بولوگی؟“

”جھوٹ بولنا تو پاپ ہے۔“

”اگر میری جان جارہی ہو اور تمہارے جھوٹ بولنے سے جان بچتی ہو تو کیا کرو گی؟“

”پھر تو میں ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے معافی مانگوں گی اور جھوٹ بول دوں گی۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گئے پھر ہچکچاتے ہوئے بولے۔ ”میں

آج تک صرف باپ کی نظروں سے تمہیں دیکھتا رہا۔ ماں بن کر دیکھتا اور سوچتا تو بہت پہلے ہی تمہاری تاریخ پیدائش بدل دیتا اور تمہیں اچھی طرح سکھا پڑھا دیتا کہ تم تیس کی نہیں بیس برس کی ہو۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو باپو؟“ وہ سامنے آکر نیچے چٹائی پر بیٹھ گئی۔

”جو آج تک نہ سمجھ سکا‘ وہی کہہ رہا ہوں اور سمجھا رہا ہوں۔ میری بیٹی میں کسی بات کی کمی نہیں ہے بلکہ زیادتی ہے۔ عمر زیادتی کر رہی ہے۔ تیس کی گنتی پڑھ کر آنے والے رشتے دور ہی سے واپس ہوجاتے ہیں۔“

شانتا نے ایک گہری سانس لے کر سر کو جھکا لیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”میں ہر پہلو سے سوچ رہا ہوں۔ یہاں میرے سچ نے گڑبڑ کردی ہے۔ ہمارا جھوٹ کام نہیں آئے گا۔ میں یہ محلّہ‘ یہ بھوپال شہر چھوڑ دوں گا۔ کل شام کی گاڑی سے ہم رائے پور جائیں گے۔ تمہاری نانی اور ماموں راضی خوشی تمہاری عمر چھپائیں گے۔ ننھیال میں تمہارے خلاف بولنے والا کوئی دوسرا رشتے دار نہیں ہے۔ میں یہاں سے چھٹی لے کر جاؤں گا۔ رائے پور کے اسکول میں کہیں ملازمت مل ہی جائے گی۔ یہاں آکر اسکول سے اپنی جمع پونجی لے جاؤں گا۔ بیس ہزار روپے ضرور ملیں گے۔ یہ جھونپڑی پلاٹ کے ساتھ پانچ ہزار میں بک جائے گی۔ جب رائے پور میں محلے محلے خبر پھیلے گی کہ اسکول ماسٹر کی ایک سندر سی بیٹی ہے۔ دس جماعتیں پاس ہے۔ عمر بیس سال ہے اور اپنے ساتھ بیس ہزار روپے نقد لائے گی تو تم دیکھنا رشتہ مانگنے والوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔“

شانتا نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے باپ سے سوال کیا تھا۔ کب تک؟ اور کب تک والی مدت ایک جھوٹ سے ختم ہورہی تھی۔ اس جھوٹ سے جوانی کے سچے خواب پورے ہونے والے تھے۔ بات صرف اتنی سی نہیں تھی۔ وہ جھوٹ بول کر گناہوں سے بھی بچ سکتی تھی۔ برسوں سے وہ شیطانی خیالات اور جذبات سے لڑتی آئی تھی۔ ہر رات کروٹیں بدلتے بدلتے‘ گیتا کے اشلوک پڑھتے پڑھتے خود کو پرسکون رکھنے کا عادی بنایا تھا۔ ایسے میں رگھو نے آکر پھر اس کے جذبات کو بھڑکانا شروع کیا تھا۔ وہ سوچتی تھی‘ رگھو کسی رات جھونپڑی میں آجائے تو وہ کچھ نہیں کہہ سکے گی۔ باپو کو بھی آواز نہیں دے گی۔

آنے والا اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا' یہی سوچ سوچ کر بدن جلنے لگتا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ بھٹکنے کا موقع ملتا تو بھٹک جاتی' سنبھلنے کا یقین آتا تو سنبھل جاتی۔ باپ نے یقین دلایا تھا' ایک جھوٹ اسے گناہوں سے نجات دلا سکتا ہے لہٰذا وہ کسی حیل و حجت کے بغیر جھوٹ بولنے پر راضی ہوگئی تھی۔

باپ بیٹی کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ چند کپڑے' کھانے کے برتن اور کتابیں تھیں۔ راشن کبھی جمع نہیں ہوتا تھا۔ روز آتا تھا' روز کھا لیتے تھے۔ انہوں نے رات کو کپڑے اور کتابیں سمیٹ کر گٹھری باندھ لی۔ میلے کپڑے الگ رکھے تاکہ دھو کر لے جائیں۔ دیال ماسٹر بازار جاکر صابن لے آئے۔ رات ساڑھے دس بجے تک باپ اپنے کپڑے دھوتا رہا بیٹی اپنے دھوتی رہی۔ دھونے کے بعد وہ اپنے کپڑے باہر ایک رسی پر لاکر پھیلاتا تھا۔ گھر کے اندر بیٹی دوسری رسی باندھ کر اپنے کپڑے سوکھنے کے لئے ڈال دیتی تھی چونکہ ان کے پاس استری نہیں تھی اس لئے دھونے کے بعد کپڑے نہیں نچوڑتے تھے۔ نچوڑنے سے شکنیں پڑ جاتی تھیں۔ یونہی گیلے کپڑے پھیلا دیتے تھے جن میں سے پانی ٹپکتا رہتا تھا۔

رگھو کا حواری رات کے اندھیرے میں دو بار جھونپڑی کے پاس سے گزر کر گیا تھا۔ فیکٹری کی دیوار کے پاس رگھو اور دوسرے ساتھی آگ جلا کر تاپ رہے تھے اور ایک بوتل سے اپنے اپنے گلاس میں شراب لے کر پی رہے تھے۔ رگھو دوسری بوتل سے منہ لگا کر پی رہا تھا۔ اس نے آنے والے سے پوچھا۔ "کیوں بے چھیدی لال! کیا خبر لایا؟"

"گرو۔ دونوں ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

چھیدی نے اپنے حصے کا گلاس اٹھالیا۔ رگھو نے بوتل منہ سے ہٹا کر کہا۔ "سالا روتا ہوا جاتا ہے اور مرنے کی خبر لاتا ہے اور ان باپ بیٹی کو کیا ہوا ہے' آج اتنی رات تک کیوں جاگ رہے ہیں؟"

"میں پہلی بار گیا تو کپڑے دھو رہے تھے۔ دوسری بار جھونپڑی کے بالکل قریب گیا۔ میرا نام چھیدی ہے۔ میں نے ایک چھید سے جھانک کر دیکھا' دونوں بھات کھا رہے تھے اور کل شام کی گاڑی سے رائے پور جانے کی باتیں کر رہے تھے۔"

رگھو نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "بڈھا اس چڑیا کو یہاں سے اڑانا مانگتا ہے مگر کل شام بہت دور ہے۔ میں آج ہی چھوکری کی ایسی کی تیسی کردوں گا۔"

وہ چپ ہو کر سننے لگا۔ فیکٹری کا گھڑیال ٹن ٹن کی آواز سے بارہ بجا رہا تھا۔ وہ بوتل ہاتھ میں لئے اِدھر سے اُدھر جانے لگا۔ ایک نے کہا۔ "گرو! اگر پکڑے گئے تو وہ تھانیدار بہت مارے گا۔ وہ تمہیں کیسی تڑی دے رہا تھا۔"

اس نے بوتل سے منہ لگا کر چند گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ ماسٹر اس لئے تھانے گیا تھا کہ ابھی اس کی عجت ہے۔ عجت چلی جائے گی تو کسی کو منہ نہیں دکھائے گا۔ کچھ بولے گا تو بیٹی چھنال کہلائے گی۔ سالا ماسٹر میرے پاس ہاتھ جوڑنے آئے گا۔ چھوکری پٹاخا ہے۔ میرے سینے میں گھس گئی ہے۔ ماسٹر بولے گا تو میں اسے سال چھ مہینے کے لئے رکھ لوں گا۔ بعد میں اچھے دام مل جائیں گے۔"

کوئی پون گھنٹے میں بوتل خالی ہوگئی۔ اس نے بوتل کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"چلو۔"

سب اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اس کے پیچھے چلنے لگے۔ وہ دبی دبی آواز میں سمجھا رہا تھا۔ "تم لوگ بڈھے کو قابو میں کرلینا۔ میں اندر جاکے چھوکری سے نمٹ لوں گا۔"

وہ جھونپڑیوں کے درمیان سے دبے پاؤں گزرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ تک پہنچ گئے۔ دیال ماسٹر برآمدے میں بستر بچھا کر لیٹے ہوئے تھے۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ نئے سرے سے بیٹی کی زندگی شروع کرنے کے سلسلے میں سوچ رہے تھے' جو منصوبہ بنایا ہے اس کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کرنا چاہئے تاکہ کہیں کوئی خامی نہ رہے' ورنہ آگے چل کر بیٹی کا سکھی سنسار برباد ہوجائے گا۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گئے۔ آہٹ سی سنائی دی۔ یوں لگا جیسے آس پاس کوئی ہے انہوں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے؟"

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ سر چکرا گیا۔ پھر انہیں ہوش نہ رہا۔ وہ ایک طرف ڈھلک گئے۔ چھیدی لال نے سرگوشی میں پوچھا۔ "ابے کہیں ہتیا تو نہیں کردی؟"

دوسرے نے ماسٹر کی ناک کے پاس ہاتھ رکھا پھر دل پر ہاتھ رکھا اس کے بعد کہا۔
"جندہ ہے۔ سانس چل رہی ہے' دل دھڑک رہا ہے۔"

رگھو نے ان کے درمیان جھک کر کہا۔ "یہ کسی وقت بھی ہوش میں آسکتا ہے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔ آنکھیں بھی کپڑے سے باندھ دو۔ یہ نہ کچھ دیکھے گا نہ بولے گا۔ اٹھنا چاہے گا تو تم سب دبوچ کے رکھنا۔"

شانتا نے اندر سے پوچھا۔ "باپو! کون ہے؟ کوئی آیا ہے کیا؟"

رگھو دبے قدموں دروازے کے پاس آکر بولا۔ "میں ہوں رگھو۔ دروازا کھول دے۔"

شانتا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "باپو کہاں ہیں؟"

"ماسٹر آرام سے سو رہا ہے۔"

"تو جھوٹ بولتا ہے۔ تو نے کچھ کیا ہے۔ باپو گہری نیند نہیں سوتے۔ میری ایک آواز پر اٹھ جاتے ہیں۔ باپو............ باپو............ باپو............"

وہ آوازیں دینے لگی۔ رگھو نے کام بگڑتے دیکھ کر دروازے پر ایک زور کی لات ماری۔ جھونپڑیوں کے دروازے اور دیواریں محض پردے کے لئے ہوتی ہیں۔ ایک لات پڑتے ہی دروازہ کھل بھی گیا' آدھا ٹوٹ بھی گیا۔ شانتا کے حلق سے چیخ نکلی۔ رگھو نے ایک ہاتھ سے اسے قابو میں کیا' دوسرے ہاتھ سے منہ دبایا وہ خود کو چھڑانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ رگھو نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا کر رہی ہے! دن کو مسکرا کر بول رہی تھی۔ ابھی موقع ملا ہے تو نخرے دکھا رہی ہے۔"

وہ منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹا کر بولی۔ "کمینے بدمعاش! تو مجھے بازاری سمجھ کے آیا ہے۔ میں جان دے دوں گی پر عزت نہیں دوں گی۔ میں آخری بار سمجھاتی ہوں' بھاگ جا نہیں تو چلا چلا کر............"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے رگھو نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آہستگی سے پکارا۔
"چھیدی لال! ادھر آ۔ سالی کتیا کی طرح بھونک رہی ہے۔ جلدی آ۔"
وہ دوڑتا ہوا آیا۔ رگھو نے کہا۔ "کپڑا لا کے منہ میں ٹھونس دے۔"

ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ساڑھی بندھی ہوئی تھی۔ چھیدی لال اسے کھینچ کر لے آیا۔ رگھو نے ہاتھ ہٹا کر شانتا سے کہا۔ "منہ کھول۔"

وہ ہونٹوں کو سختی سے بند کر کے انکار میں سر ہلانے لگی۔ رگھو نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر گلا دبایا تو چیخ نکل گئی۔ چیخنے کے دوران منہ کھلا تو چھیدی لال نے ساڑھی کا ایک کونا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ رگھو غصے سے بولا۔ "ابے حرام کے پلے! اتنی بڑی ساڑھی کیسے گھسائے گا اور منہ کیسے باندھے گا؟"

"گرو! ادھر اس کے باپ کے ساتھ بھی یہی کیا۔ اس کی دھوتی کا ایک کونا منہ میں ٹھنس دیا' باقی دھوتی کو اس کی گردن تک لپیٹ دیا۔ آنکھ بھی بند' منہ بھی بند۔ یہ بھی نہ دیکھ سکے گی' نہ بول سکے گی۔"

اس نے بولتے رہنے کے دوران شانتا کے پورے چہرے کو گردن تک ساڑھی سے لپیٹ دیا۔ رگھو نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھایا۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ منہ سے اوں اوں کی ہلکی آواز نکل رہی تھی۔ وہ اسے چٹائی پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "چھیدی! باہر جا۔ کوئی بھی اندر آنے کو مانگے تو سالے کو چاقو مار دینا۔"

چھیدی باہر چلا گیا۔ وہ شانتا کے چھپے ہوئے چہرے کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ "یہ ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دے۔ جیادہ رنگ میں بھنگ ڈالے گی تو میرے آدمی آ کے تیرے ہاتھ پاؤں باندھیں گے۔ ابھی میں اکیلا ہوں۔ کیا تو سب کے سامنے راجی ہوگی۔"

وہ تڑپنا اور جدوجہد کرنا بھول گئی۔ یہ کیسے گوارا کرتی کہ دوسرے تماشا دیکھنے آئیں۔ رگھو نے اس کے گریبان کو پکڑا پھر ایک جھٹکے سے کھینچا۔ چر چر............ کی آواز کے ساتھ گریبان کا ایک حصہ پھٹ کر اس کے ہاتھ میں آگیا۔ شانتا نے لرز کر دل میں کہا۔ "ماں جگ دمبے میری رکھشا کر............"

گریبان کا وہ پھٹا ہوا حصہ رگھو کی مٹھی میں یوں تھا جیسے فاتح کے ہاتھ میں پرچم لہرا رہا ہو۔ اسی لمحے اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ ہاتھ سے کپڑے کی دھجی چھوٹ گئی۔ اس نے دوسری بار سانس لی پھر گھبرا کر دونوں ہاتھ ناک اور منہ پر رکھ لئے۔ ایک جلتی ہوئی آگ محسوس ہو رہی تھی جو ناک سے ہو کر حلق سے گزر کر کلیجے تک پہنچ رہی تھی۔ منہ

اور ناک پر ہاتھ رکھنے کے باوجود سر چکرا گیا۔ وہ اِدھر سے اُدھر لڑکھڑا رہا تھا۔ وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن میدان چھوڑ کر بھاگنے میں بے عزتی سمجھ رہا تھا۔ ابھی سمجھنا چاہتا تھا' یہ اچانک کیا ہو رہا ہے؟

دور دور تک عورتوں اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں اور آتے آتے چند سیکنڈ میں ختم ہو گئی تھیں۔ کتنے ہی بھاگنے والے چند قدموں کے بعد ہی دھپ سے زمین پر گرنے کی آخری آواز سنا چکے تھے۔ تب رگھو کی سمجھ میں آیا کہ اس اکیلے پر نہیں' پوری بستی پر کوئی بلا آئی ہے۔ وہ تازہ ہوا کے لئے باہر کی طرف لپکا۔ مگر لڑکھڑا کر آدھا اندر اور آدھا دروازے کے باہر اوندھے منہ گر پڑا۔

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ان آنکھوں سے اس قدر پانی بہہ رہا تھا کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے ناز تھا کہ اس کا جسم فولاد ہے۔ اس فولاد میں اب کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ کسی طرح گھسٹتا ہوا باہر آیا۔ سینے کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ سانس لینا نہیں چاہتا تھا مگر کب تک روک سکتا تھا۔ اندر کی جلن کو باہر نکالنا نہیں چاہتا تھا اور باہر کی تازہ ہوا پھیپھڑوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسے خوش فہمی ہوئی' اس بار تازہ ہوا ملے گی۔ اس نے زور کی سانس کھینچی۔ وہ زندگی کی آخری تکلیف تھی۔ اس کی گردن ایک طرف گھوم گئی۔ اس نے آخری بار کمرے کے اندر لالٹین کی روشنی میں شانتا کو دیکھا۔ وہ چٹائی پر اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کا حسین اور پرشباب جسم بلا رہا تھا۔ آؤ تم لوگ کتنے شہ زور اور مغرور ہوتے ہو۔ غرور میں موت کو بھول جاتے ہو۔ کہاں ہے جوانی کی مستی اور طاقت کا جوش؟ آؤ..........''

جس طرح کتے نحوست سے روتے وقت لمبی آواز نکالتے ہیں اسی طرح رگھو نے بڑے کرب سے آخری آواز نکالی پھر دم توڑ دیا۔ شاید اسی کو کتے کی موت مرنا کہتے ہیں۔

حقیقت یہ نہیں تھی کہ رگھو کو اپنے برے اعمال کی سزا میتھائل ایسوسائیٹ گیس کے ذریعے ملی تھی۔ اگر یہ ایک ظالم اور گناہ گار کی سزا ہوتی تو بھوپال کے ہزاروں مظلوم اور بے گناہ ایک ہی وقت میں رگھو کے ساتھ مارے نہ جاتے۔ آندھی طوفان ہو' منہ زور سیلاب ہو یا ایٹم بم کی تباہ کاریاں ہوں' ہمیشہ چند ظالموں کے ساتھ ہزاروں لاکھوں مظلوم

اور بے گناہ مارے جاتے ہیں۔ یہی ازل سے انسانی تاریخ ہے اور یہی انسانی مقدر ہے۔

رات گزرتی جارہی تھی۔ دلوں میں دہشت پیدا کرنے والا سناٹا تھا۔ کہیں سے ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آہٹ پیدا کرنے والے انسان اور حیوان لاشوں کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ لاشوں کے شہر میں منحوس آوازیں نکال کر رونے والے کتے بھی نہیں رہے تھے۔

ہوا کبھی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی۔ اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ وہ زہریلی گیس ہوا کے ساتھ تھی اور اتنی ہی تھی جتنی ٹنکی سے خارج ہو چکی تھی۔ بھارت ہیوی الیکٹریکلز کمپنی لمیٹڈ کے انجینئروں نے آکر گیس پر قابو پالیا تھا۔ ٹنکی بند کر دی تھی۔ جب گیس بند ہوئی تو فیکٹری اور اس کے ساتھ والے شانتی ٹاؤن کی ہوا زہر سے خالی ہونے لگی۔ وہ زہریلی ہوا اب آگے دوسرے علاقوں میں جارہی تھی۔ پیچھے تازہ ہوا ملنے لگی تھی۔

لیکن اب تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے کون باقی رہا تھا؟

شانتا پھٹے ہوئے گریبان کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے اوندھی پڑی رو رہی تھی۔ چٹائی سے اٹھنے کی جرأت نہیں تھی۔ ہر آنے والا لمحہ ڈرا رہا تھا کہ رگھو اس پر جھپٹنے ہی والا ہے۔ اس نے عورتوں اور بچوں کی چیخیں سنی تھیں۔ کچھ لوگوں کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ محلے والوں کے سامنے تماشا بن گئی ہے۔ پھٹے ہوئے بلاؤز کے ساتھ کسی کو منہ نہیں دکھا سکے گی۔ یہی سوچ کر وہ رو رہی تھی۔

پھر اسے گہری خاموشی محسوس ہوئی۔ پورا محلّہ بلکہ پوری دنیا خاموش لگ رہی تھی۔ یہی سمجھ میں آیا کہ رگھو کی دہشت سے سب کو سانپ سونگھ گیا ہے اور آنے والے چپ چاپ اپنے گھروں میں جاچکے ہیں۔ یہ سوچتے ہی وہ رونے لگی۔ سہمی ہوئی سی اس درندے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ نہیں آرہا تھا اور وقت گزرتا جارہا تھا۔ وہ فیصلہ کرچکی تھی' چاہے کچھ ہو جائے' اپنی جگہ سے نہیں ہلے گی۔ سر سے گردن تک ساڑھی لپٹی ہوئی تھی۔ گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہٹا کر وہ رگھو کا منہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یوں بے حس و حرکت لیٹے رہنے کے باعث ابھی تک زندہ

ہے۔ باپ بیٹی نے کوئی ڈیڑھ گھنٹے پہلے اپنے اپنے کپڑے دھو کر سکھانے کے لئے پھیلائے تھے۔ کپڑے نچوڑے نہیں گئے تھے۔ سردی کی اوس بھری بھیگی ہوا میں وہ جوں کے توں گیلے ہی رہے۔ جب باپ کے منہ پر دھوتی اور بیٹی کے منہ پر ساڑھی باندھی گئی تو ان کپڑوں سے پانی نکل رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زہریلی گیس ان کے نتھنوں تک نہ پہنچ سکی۔ تقدیر عجیب تماشے دکھاتی ہے۔ دشمن عزت لوٹنے آیا تھا مگر عزت نہ لے سکا۔ باپ بیٹی کو زندہ رہنے کا بہانہ دے گیا۔

وہ جیسے زندہ لاش بن گئی تھی۔ اسی طرح بے حس وحرکت پڑی ہوئی تھی۔ مگر کب تک یوں اوندھی پڑی رہتی؟ ایک گھنٹا گزر گیا۔ اچانک ہی وہ چیخ کر بولی۔ ”شیطان کے بچے! میں لیٹے لیٹے مرجاؤں گی۔ مگر تیری صورت نہیں دیکھوں گی۔ اب تو نے ہاتھ لگایا تو اسی ساڑھی کا پھندا بنا کر مرجاؤں گی۔ ذلیل، کمینے! خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟ کیا مر گیا ہے؟“

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ ذرا چپ رہ کر بولی۔ ”بھگوان کرے، تجھے موت آئے۔ جیسے تو مجھے ڈرا رہا ہے، ویسے ہی تو سہم سہم کر، تڑپ تڑپ کر مرے۔ مرجا کتے، مرجا۔ کتے مرجا!“

وہ پھر چپ ہو کر جواب کا یا ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔ نہ جواب مل رہا تھا اور نہ ہی وہ ردعمل ظاہر کرنے آرہا تھا۔ تب اس نے ساڑھی کے باقی حصے کو ایک ہاتھ سے ٹٹول کر پھٹے ہوئے گریبان پر رکھا۔ اس کے بعد چہرے پر سے لپٹی ہوئی ساڑھی کھولنے لگی۔ ایسے وقت بھی وہ اوندھی پڑی رہی۔ ساڑھی، ناک اور منہ سے ہٹ گئی۔ تب اس نے عجیب سی بو محسوس کی۔ ناگوار بو سے بچنے کے لئے کوئی بھی بے اختیار ناک پر رومال رکھ لیتا ہے۔ اس نے بھی ساڑھی رکھ لی۔ بو کا احساس ختم ہوگیا۔ اس نے آہستہ آہستہ سر گھما کر دیکھا۔ دروازے کے پاس دو مردانہ پاؤں نظر آئے جیسے کوئی اوندھا پڑا ہو۔ وہ کوئی غنڈہ ہی ہوسکتا تھا۔ پتلون کے پائینچے بھی نظر آرہے تھے۔

اس نے آواز دی۔ ”باپو!“

جواب نہیں ملا۔ وہ جلدی سے سینے کو ڈھانپتے ہوئے بیٹھ گئی پھر ساڑھی کو اپنے

اطراف اچھی طرح لپیٹ کر بولی۔ ”باپو! جواب دو باپو!“

وہ پریشان ہوگئی۔ موجودہ حالت میں باپ کے پاس برآمدے میں نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے کٹھری میں سے دوسرا بلاؤز نکالا۔ پھٹے ہوئے کو اتارا، دوسرے کو پہنا، ساڑھی کو درست کیا پھر لالٹین اٹھا کر جیسے ہی دروازے تک آئی، مارے دہشت کے چیخ پڑی۔ اس کے دماغ کو شدید جھٹکا پہنچا۔ اس نے کبھی ایک ساتھ ایک ہی جگہ اتنی لاشیں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ لالٹین اٹھائے چیختی چلاتی ہوئی کمرے کے اندر اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگی۔ وہ دوڑ رہی تھی۔ اس کا سایہ مختلف دیواروں پر دوڑ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، بھاگ کر کہاں جائے؟ باہر لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور اندر چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ اچانک وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ لالٹین بھی گری اور یوں بھڑکنے لگی جیسے بجھنے ہی والی ہو۔ اس نے جلدی سے لالٹین کو سیدھا کیا۔ دوڑنے کے باعث وہ ہانپ رہی تھی۔ ہانپنے کی وجہ سے پھر بو محسوس ہوئی۔ اس نے آنچل کو ناک پر رکھا پھر ہٹا کر سونگھا۔ تب خیال آیا یہ فیکٹری کی گیس ہے۔

دیال ماسٹر نے اسے میتھائل ایسوسائیٹ کے متعلق بہت کچھ بتایا تھا۔ بچاؤ کی فوری تدبیر بھی بتائی تھی۔ اس نے دور پڑی ہوئی گیلی ساڑھی کو دیکھا پھر پانی کے ڈرم کے پاس آئی جو ساڑھی پہنے ہوئے تھی اس کے آنچل کو دور تک اچھی طرح بھگو لیا۔ اگرچہ اب خطرہ نہیں رہا تھا تاہم فضا میں زہریلے اثرات اور کچھ بو رہ گئی تھی۔ اب ایک ایک بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ زہریلی گیس کے نتیجے میں اتنی لاشیں نظر آرہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ ”کیا باپو بھی؟“

فوراً ہی وہ نہیں کہہ کر چیختی ہوئی لالٹین اٹھا کر بے دھڑک باہر آگئی۔ باپ کی محبت نے خوف کو بھلا دیا۔ پھر اتنی ساری اموات کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے لالٹین زمین پر رکھ کر باپ کے چہرے سے گیلے کپڑے کو ہٹایا۔ اس کی نبض اور دل کی دھڑکن دیکھی۔ وہ زندہ تھا۔ سانس لے رہا تھا۔ اس نے خوش ہو کر گیلا کپڑا اس کی ناک پر رکھا پھر آواز دی۔ ”باپو! آنکھیں کھولو۔ باپو!“

اس نے آس پاس دیکھا۔ رگھو اور اس کے ساتھی مردہ پڑے ہوئے تھے۔ سامنے

والی جھونپڑی کے باہر درگا ماسی اور اس کی جوان بیٹی کی لاشیں نظر آئیں۔ گلی میں کندن کاکا اور رامو بھیا سمیت ان کے تمام گھر والے بے جان پڑے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ زہریلی گیس فیکٹری سے نکل کر وہاں تک کیسے آگئی تھی۔ اس نے باپ کے سر کو اٹھا کر اپنے زانو پر رکھنا چاہا تو بے ہوشی کی حالت میں منہ سے کراہیں نکلنے لگیں جس دھوتی کو چہرے پر سے ہٹایا تھا' اس پر خون کے دھبے نظر آئے۔ وہ سمجھ گئی۔ سر کے پچھلے حصے میں گہری چوٹ لگی ہے۔

اس نے باپ کی گردن اٹھا کر نیچے تکیہ رکھا۔ اپنے آنچل سے چہرے پر پانی ٹپکانے لگی۔ ایک گھنٹے سے گیلا کپڑا منہ پر تھا' انہیں ہوش آجانا چاہئے تھا لیکن ایک تو بے چارے بوڑھے اور کمزور تھے۔ دوسرے سر پر زوردار ضرب لگی تھی......... جو ان کی برداشت سے باہر تھی۔ پتا نہیں کیسے برداشت کرکے زندہ رہ گئے تھے۔ طویل بے ہوشی تھی لیکن اب چہرے پر پانی ٹپکانے کے باعث رہ رہ کر کراہنے لگے تھے۔ اسی وقت گہرے سناٹے میں کسی کی آواز گونجنے لگی۔ کوئی میگافون پر پوچھ رہا تھا۔ "یہاں کوئی زندہ ہے؟ ہم فوری طبی امداد کے لئے اسپتال پہنچانے آئے ہیں۔ جس میں ذرا بھی جان ہے وہ ہمیں کسی طرح اپنے پاس بلائے جو آواز نہ دے سکے وہ کوئی ٹین یا ڈبا بجاوے۔ ویسے ہم ایک ایک جھونپڑی میں جاکر دیکھ رہے ہیں۔"

شانتا لالٹین اٹھا کر چیخنے لگی۔ "ہم یہاں ہیں! یہاں آؤ میرے باپو کو بچاؤ۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔ میرے باپو زخمی ہیں۔ بے ہوش ہیں۔ آجاؤ۔ میں آواز دے رہی ہوں۔ آجاؤ۔ آجاؤ۔ سہاتا کرو۔ سہاتا کرو۔"

وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں گئی وہاں سے ٹین کا خالی کنستر اٹھا کر لے آئی۔ جھونپڑی کے سامنے کھلی جگہ کھڑے ہو کر ہاتھ میں ایک لکڑی لے کر زور زور سے بجانے لگی۔ پانچ منٹ کے اندر ہی ایک ایمبولینس آگئی۔ دیال ماسٹر کو بڑی احتیاط سے اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں پہنچایا گیا۔ شانتا اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہاں دو مریض اور دو کارکن اور تھے۔ ایمبولنس چل پڑی۔ ایک شخص نے بتایا' شانتی ٹاؤن سے ستر ایسی عورتوں اور مردوں کو اسپتال پہنچایا گیا ہے' جن میں جان باقی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "بہن! تم باپ

بیٹی کیسے بچ گئے؟"

شانتا بے اختیار ہنسنے لگی۔ دل کھول کر ہنسی آرہی تھی۔ وہ جواب دینا چاہتی تھی مگر ہنسی نہیں تھم رہی تھی۔ دوسرے شخص نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے' گیس کا اثر ہے۔ پلیز بہن! نارمل رہنے کی کوشش کرو۔"

اس نے ہنستے ہنستے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں نارمل ہوں' تم نے ابھی پوچھا تھا ہم کیسے بچ گئے!"

"ہاں' یہی پوچھا تھا۔"

اس نے ہنسی پر قابو پاکر ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ "انسان کو بھگوان بچاتا ہے۔ مگر تمہیں یقین نہیں آئے گا' ہم باپ بیٹی کو شیطان نے بچایا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ساڑھی کا گیلا آنچل اپنے منہ پر ڈال لیا۔

☆======☆======☆

ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی۔ گہری اوس کے باعث دھند چھائی ہوئی تھی۔ دور تک اسٹریٹ لیمپ کی کمزور روشنیوں میں چھپے چھپے سے مکانات دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹیشن کا عملہ پلیٹ فارم پر تھا اور بھی کچھ لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام کمپارٹمنٹس سے رونے اور تکلیف سے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسٹیشن ماسٹر بھاگتا ہوا انجن کی طرف گیا۔ ڈرائیور انجن سے اتر کر آرہا تھا۔ ادھر کامنا کماری اور شنکر ٹرین سے اتر کر تیزی سے چلتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں جارہے تھے۔ اس کمرے میں صرف ایک پورٹر کھڑا ہوا تھا۔ شنکر نے پوچھا۔ "اسٹیشن ماسٹر کہاں ہیں؟"

"وہ تو اس ٹرین سے جارہے ہیں' فون سے معلوم ہوا' بھوپال میں زہریلی گیس پھیل گئی ہے۔ سب لوگ کہہ رہے تھے' اِدھر بھی گیس آنے والی ہے۔ یہاں بھی سب کے سب مرجائیں گے۔ اسی واسطے یہ سب لوگ اِدھر سے جارہے ہیں۔"

کامنا ٹیلی فون کے پاس جاکر بیٹھی ہوئی تھی۔ ریسیور کان سے لگا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "شنکر! ڈرائیور کے پاس جاؤ۔ ٹرین کو آگے نہ جانے دینا۔ لوگوں کو یہاں طبی امداد نہ ملی تو وہ آگے جاتے جاتے مرجائیں گے۔ تمہیں تو پتا ہوگا' اس چھوٹے شہر میں کتنے اسپتال اور کلینک ہیں؟"

"میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔ پہلے ڈرائیور کو روکنا ہوگا۔"

وہ چلا گیا۔ کامنا نے کہا۔ "ہیلو! ہیلو! میں لیڈی ڈاکٹر کامنا کماری بول رہی ہوں۔ بھوپال میں ہونے والی گھٹنا کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا ہوگا۔ یہاں انسانی جانوں کو بچانے کا مسئلہ ہے۔ پلیز بھارت میڈیکل بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے کسی نمبر پر بھی بات

کرادیں۔ میں تمام ڈائریکٹرز کے نمبر بتارہی ہوں' آپ نوٹ کریں۔"

وہ ذرا چپ ہوکر دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ پھر بولی۔ "میں سمجھتی ہوں' یہ ایکسچینج صرف ریلوے اسٹیشن کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے لئے ہے۔ آپ ذرا انسانی ہمدردی سے سوچئے۔ ریلوے کے اصولوں سے ذرا ہٹ کر آپ ہزاروں' لاکھوں بچوں' عورتوں اور مردوں کی جانیں بچاسکتے ہیں' ان کی دعائیں لے سکتے ہیں' نیکی کما سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے آپ کو ایک پیسہ نہیں ملے گا لیکن من کی اور آتما کی شانتی ملے گی۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ وہ بولی۔ "دھن واد۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نمبر نوٹ کریں۔"

وہ نمبر نوٹ کرانے لگی۔ اس کے بعد بولی۔ "میرے پتا جی' ڈاکٹر رامیشور پرشاد اس بورڈ کے ایک ڈائریکٹر ہیں۔ ان سے کہنا جتنی دوائیں' انجکشن اور ضروری سامان وہ بھیج سکتے ہیں' میرے سسرال کے پتے پر فوراً روانہ کردیں۔ ایک بار پھر شکریہ۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ لوگوں کی بھیڑ اس کی طرف آرہی تھی۔ سب سے آگے شنکر تھا۔ وہ اسٹیشن ماسٹر کو گردن سے پکڑ کر لارہا تھا۔ اس نے کہا۔ "کامنا! کمشنر آف پولیس کا نمبر ملاؤ اور بتاؤ' یہاں کا اسٹیشن ماسٹر ڈیوٹی چھوڑ کر ہی نہیں' ریلوے اسٹیشن کی تمام پراپرٹی چھوڑ کر بھاگنا چاہتا ہے۔ ہم نے اسے پکڑ رکھا ہے۔"

کامنا نے اسٹیشن ماسٹر کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "انہیں چھوڑ دو یہ ہمارے بزرگ ہیں۔ پتا سمان ہیں۔ میں سمجھاتی ہوں اور انہیں سمجھ لینا چاہئے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تمام آنے والوں سے بولی۔ "آپ تمام لوگوں کو بھی اچھی طرح سن لینا اور سمجھ لینا چاہئے کہ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

ایک نے پوچھا۔ "یہ آپ یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"عقل سے' علم سے اور معلومات سے کہہ رہی ہوں۔ ہوا اُتر سے دکھن کی طرف چل رہی ہے۔ یقین نہ ہو تو باہر جاکر ریلوے کا ونڈ کاک دیکھ لو' اس کا رخ شمال سے جنوب کی طرف ہے۔ باہر جاؤ اور مٹی اٹھا کر آہستہ آہستہ گراؤ۔ مٹی جنوب کی سمت گرے گی۔ آپ تمام لوگ بھوپال کے شمال میں ہیں۔ زہریلی گیس جنوب کی طرف جارہی ہے۔ پھر

آپ کی طرف کیسے آسکتی ہے؟"

سب لوگ آپس میں کچھ نہ کچھ بولنے اور مشورے کرنے لگے۔ ایک آدمی نے بھیڑ کو چیر کر آگے آتے ہوئے کہا۔ "ہم ابھی مٹی اٹھا کر دیکھے رہیں۔ مٹی دکھن طرف جاوے ہے۔ ای بہنا ٹھیک کہت ہے۔ ہمرے علاکے میں کونو کھترہ ناہی ہے۔"

شنکر نے کہا۔ "ابھی ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ ہم سب انسان ہیں اور اپنی ماؤں اور بہنوں کی جانیں بچانے کے لئے دن رات ایک کرسکتے ہیں۔ بھائیو! میں ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرتا ہوں' اس چھوٹے سے شہر میں جتنے اسپتال اور کلینک ہیں' آپ ان متاثرین کو ہاتھوں ہاتھ وہاں پہنچانے میں جلدی کریں۔"

کامنا ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے بولی۔ "آیئے' میں عورت ہو کر پہل کرتی ہوں۔ آپ مرد ہیں' پیچھے نہ رہیں۔"

یہ جوش دلانے والی بات تھی۔ سب کے سب مختلف کمپارٹمنٹ میں گھس کر متاثرین کو سہارا دے کر لانے لگے۔ جو چل نہیں سکتے تھے' انہیں بازوؤں میں اٹھا کر کاندھے پر لاد کر لے جانے لگے۔ ایک پورٹر دوڑتا ہوا آیا اور کامنا سے بولا۔ "اسٹیشن ماسٹر بلاتے ہیں' آپ کا فون آیا ہے۔"

وہ شنکر کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں آئی۔ پھر ریسیور کان سے لگا کر بولی۔ "ہیلو میں لیڈی ڈاکٹر کامنا کماری بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے باپ کی آواز سنائی دی۔ "بیٹی تمہاری آواز سن کر جان میں جان آئی ہے۔ ہمارا داماد شنکر کہاں ہے؟"

"اوہ' پتا جی! آئی لو یو۔ شنکر میرے ساتھ ہیں۔ ہم کسی طرح بچ کر بھوپال سے پچیس میل دور آگئے ہیں۔ پھر بھی مجھ دلہن کی بدنصیبی ہے' شاید کوئی باراتی زندہ نہیں رہا ہے۔ شنکر کے پتا جی ہمارے سامنے ہی بھاگتے ہوئے کہیں گئے تھے۔ پتا نہیں' وہ کس حال میں ہوں گے۔"

"فکر نہ کرو۔ وہ خیریت سے ہوں گے۔ بورڈ کے تمام ڈائریکٹرز ایک ہیلی کاپٹر چارٹرڈ کرا رہے ہیں۔ ہم طبی امداد کا ضروری سامان لے کر آئیں گے تم کہاں ملوگی؟"

"ذرا ایک منٹ' ابھی بتاتی ہوں۔"

اس نے شنکر سے کہا۔ "پتا جی ضروری سامان لے کر آنے والے ہیں۔ ہمیں بھی صبح تک بھوپال پہنچنا چاہئے۔ وہاں سسر جی اور دوسرے باراتیوں کو ہماری ضرورت ہوگی۔"

شنکر نے ریسیور لے کر کہا۔ "انکل! نمستے! میں آپ کا بیٹا شنکر بول رہا ہوں۔ ہم یہاں رکشا ٹیکسی یا پرائیویٹ گاڑی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے کل صبح تک بھوپال میں ہوں گے۔ مجھے باپو جی کی بڑی چنتا ہے۔"

"بیٹے! فکر کرنے سے دماغی پریشانی بڑھتی ہے۔ بھگوان نے چاہا تو تمہارے باپو جی خیریت سے ہوں گے۔ میں وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے انہیں طبی امداد پہنچاؤں گا۔"

کامنا نے ریسیور لے کر بات کی۔ پھر ماں سے بھی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد وہ ریسیور رکھ کر اسٹیشن سے باہر آئے۔ ایک شخص نے انہیں اسپتال تک پہنچا دیا۔ وہ چھوٹا سا شہر تھا چھوٹا سا اسپتال تھا۔ وہاں دو جونیئر ڈاکٹر' چار نرسیں' دو کمپاؤنڈر اور چھ وارڈ بوائے تھے۔ کامنا لندن سے اعلیٰ ڈگری لے کر آئی تھی۔ وہاں سب ہی اس سے مرعوب تھے لیکن وہ اپنی برتری کو بالائے طاق رکھ کر ان کے ساتھ ایک ایک مریض کو اٹینڈ کر رہی تھی اور انہیں زہریلی گیس کے اثرات سمجھاتی جاتی تھی۔ "دیکھو' جو بھی گیس سے متاثر ہوا ہے اس کا بیان توجہ سے سنا کرو۔ یہ بے چارے صحیح طرح بیان بھی نہیں کرسکیں گے۔ کیونکہ زہریلی گیس سے نروس سسٹم پر اثر پڑتا ہے۔ یہ دماغی طور پر کمزور ہوں گے۔ اس ظالم گیس سے پھیپھڑوں کے اندر کی جھلی جل جاتی ہے۔ اس میں سوراخ ہو جاتے ہیں۔ معمولی جراثیم بھی سانس کی نالی سے پھیپھڑوں میں پہنچ کر انفیکشن پیدا کرتے ہیں۔ جسم کا رقیق مادہ پھیپھڑوں میں بھر جاتا ہے۔ انسان اپنے ہی خون اور مادے میں ڈوب کر موت کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پیٹ کی بیماریاں' آنتوں کا کینسر' ریڑھ کی ہڈی اور دماغ کی تکلیفیں بھی ظاہر ہوتی ہیں لیکن سب سے پہلی تکلیف آنکھوں میں ہوتی ہے۔ ہمیں صرف ان کی جان ہی نہیں بچانا ہے' انہیں اندھے پن سے بھی محفوظ رکھنا ہے۔"

وہاں کے اسپتال اور مختلف کلینکس میں دو سو سے زیادہ متاثرین پہنچائے گئے تھے

جن میں تقریباً اسی افراد اندھے ہو چکے تھے۔ باقی لوگوں کی بینائی بحال رکھنے کی کوشش کی جاری تھی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ کئی طرح کے امراض میں گرفتار ہوگئے تھے اور وہاں ہر مرض کی دوا موجود نہیں تھی۔ صبح تک پچاس افراد مر چکے تھے۔

شنکر نے کئی بار ریڈیو آن کیا۔ خیال تھا' دہلی ریڈیو بھوپال کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرے گا لیکن اس سلسلے میں تمام سرکاری ذرائع خاموش تھے۔ کانگریس حکام محتاط تھے۔ اتنے بڑے حادثے کی ذمہ داری ان پر عائد ہونے والی تھی۔ وہ مکمل احتیاطی تدابیر کے بعد ہی ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ سے اس اندوہناک المیے کی خبر سنانا چاہتے تھے۔ انہیں اطمینان تھا کہ آدھی رات کے بعد حادثہ ہوا ہے' لہٰذا صبح کے اخبارات میں بھوپال ٹریجڈی کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔ ان کے ضمیمے دوسرے دن شام تک منظرِ عام پر آسکیں گے۔

شنکر نے فون کے ذریعے بھوپال کے حمیدیہ اسپتال سے رابطہ قائم کیا۔ وہاں کے کاؤنٹر کلرک نے بتایا' زہریلی گیس کا رخ فیکٹری سے جنوب کی طرف تھا۔ وہ چند علاقوں سے گزرتی گئی ہے۔ بھوپال کے مشرقی اور مغربی علاقے محفوظ ہیں۔ وہ گیس جن علاقوں سے گزر چکی ہے وہاں کے متاثرین کو اسپتال پہنچایا جارہا ہے۔ ان میں بڑے بڑے بزنس مین اور علاقے کی مشہور ہستیاں بھی ہیں۔

شنکر نے کہا۔ "میرے باپو جی کا نام رام داس گھوکھلے ہے' وہ مشہور دواؤں کی کمپنیوں کے سول ایجنٹ ہیں۔ پورے بھوپال میں دوائیں سپلائی کرتے ہیں۔ کیا تم کسی طرح ان سے............"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "سمجھ گیا جناب! آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ اسپتال کے دو نمبر وارڈ میں ہیں اور خطرے سے باہر ہیں۔"

شنکر ریسیور رکھ کر دوڑتا ہوا کامنا کے پاس آیا۔ وہ تھکن سے چُور تھی پھر بھی چیمبر سے نکل کر مریضوں کو دیکھنے جارہی تھی۔ شنکر نے آتے ہی اسے گلے سے لگالیا۔ خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ "باپو جی زندہ ہیں۔ خطرے سے باہر ہیں۔ حمیدیہ اسپتال کے دو نمبر وارڈ میں ہیں۔"

کامنا جواباً خوشی کا اظہار کرنا چاہتی تھی مگر کچھ کہہ نہ سکی' شنکر اس پر بے اختیارانہ جھک گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے وقت ٹھہر سا گیا۔ ان لمحات میں یاد آیا کہ آج ان کی سہاگ رات تھی جو تقریباً گزر چکی ہے۔ اب صبح ہونے والی ہے۔ کیا سہاگ رات کی صبح ایسے ہی ہوا کرتی ہے۔

اس کے دلہانے اسے چند لمحوں کے لئے گم کردیا تھا۔ پورے بدن میں گرم آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اس کے قدم زمین پر نہیں تھے' وہ زمین سے آسمان کی طرف اڑتی جارہی تھی۔ شنکر نے چھوڑا تو اس کا سر چکرا گیا۔ نگاہوں کے سامنے شوہر کا چہرہ دھندلا گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے سر کو تھام لیا۔ آگے پیچھے ڈگمگانے لگی۔ شنکر نے بازوؤں میں سنبھال کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ سر ایک طرف ڈھلکنے لگا تھا شنکر نے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ ڈاکٹر کی میز پر سے سامان ہٹاتے ہوئے وہاں لٹا دیا۔ اس کے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے آواز دی۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا گیا۔ ایک ڈاکٹر کو پکڑ کر لے آیا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔ پھر کہا۔ "ڈونٹ وری۔ سانس نارمل ہے۔ میرا خیال ہے' دماغ پر بوجھ پڑا ہے۔ زیادہ تھکن کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی ہیں۔ آپ آرام سے بیٹھیں' یہ جلدی ہی ہوش میں آجائیں گی۔"

شنکر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ وہاں سے کامنا کی موہنی سی صورت نظر آرہی تھی۔ چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ بیمار سی لگ رہی تھی۔ اس پر بڑا پیار آرہا تھا۔ بے چاری دو راتوں سے جاگ رہی تھی۔ میکے میں تمام رات طرح طرح کی رسمیں ہوتی رہیں۔ سہیلیوں کی شرارتوں نے سونے نہیں دیا۔ صبح ذرا موقع ملا تو نیند نہیں آئی۔ آنکھوں میں شنکر بسا ہوا تھا۔ اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ جلدی سے سہاگ رات میں قدم رکھنے کو کہہ رہا تھا۔ جب اس نے پیا کے دیس میں پہلا قدم رکھا تو موت نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کا اثر دماغ پر پڑا کہ وہ خوش قدم نہیں کہلائے گی۔ اس نے جوانی کے تپتے ہوئے جذبات کو چھپالیا تھا۔ چھپانے سے جذبات سرد نہیں پڑتے اور لاوا بن جاتے ہیں۔ ایسے میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہزاروں لوگوں کے علاج کی ذمے داری سر پر آپڑی۔ اس نے پہلے

کبھی اتنے سارے مریضوں کو بیک وقت نہیں جھیلا تھا۔ وہ جسمانی اور دماغی تھکن کے باوجود بڑے حوصلے سے آرام کئے بغیر کام کئے جا رہی تھی۔ ایسے میں شنکر نے پکڑ کر اچانک ہی اندر کے لاوے کو اچھال دیا۔ اس کا تھکا ہوا دماغ اس محبت بھری واردات کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ چکرا کر حواس کھو بیٹھی۔

اسپتال میں آنے جانے والوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بھوپال میں جنہیں رکشا ٹیکسی مل گئی' وہ اس میں فرار ہو کر یہاں پہنچ گئے تھے' وہ بھی زہریلی گیس سے متاثر ہوئے تھے۔ اسپتال میں پہلے ہی مریض کئی گنا زیادہ تھے' اب اور تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک وارڈ بوائے ڈاکٹر کو بلانے آیا۔ ڈاکٹر نے شنکر سے کہا۔ "انہیں ہوش آ رہا ہے فی الحال آرام کی ضرورت ہے۔ آپ انہیں مریضوں کے پاس نہ جانے دیں۔"

وہ چلا گیا۔ شنکر نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ کامنا کے پاس آیا۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہی تھی۔ اس نے سر کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔ "کامنا! میری جان! کیسی ہو؟"

اس نے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا۔ شنکر نے اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ بولی۔ "سوری! میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔"

"غلطی میری ہے۔ میں نے نفسیات میں ایم اے کیا ہے' اتنی سی بات نہ سمجھ سکا کہ عورت کے دل میں جذبات کا طوفان ہو اور دماغ پر نہ ختم ہونے والے فرائض کا بوجھ ہو تو اسے اچانک ایک لمحے کا پیار نہیں دینا چاہئے۔ وہ نہ جذبات کی طرف آ سکتی ہے نہ فرائض کی طرف جا سکتی ہے بیچ ہی میں گر پڑتی ہے۔ مجھے سوری کہنا چاہئے۔ میں نے تمہیں شاک پہنچایا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "جو ہوا سو ہوا۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ چلو مسکراؤ۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک وعدہ کرو گی؟"

"کچھ جانے بوجھے بغیر کیسے وعدہ کروں؟"

"کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟ پلیز اپنی بھلائی کے لئے ایک وچن دو۔"

"اچھا' وچن دیتی ہوں' بولو۔"

"اب تم کسی مریض کو اٹینڈ نہیں کرو گی۔"

"اوہ نو!" وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میں ایسا وعدہ کر کے ڈاکٹر کے معزز پیشے کو نیچا ہرگز نہیں دکھاؤں گی؟"

"تم وعدہ کر چکی ہو۔ کیا زبان سے پھرنا چاہتی ہو؟"

وہ بے بسی سے بولی۔ "اس وعدے کی مدت کیا ہے؟"

"جب تک جسمانی اور دماغی تھکن دور نہ ہو اور تم ڈیوٹی کے لئے بالکل فٹ نہ ہو جاؤ۔"

"جناب کو کیسے معلوم ہوگا کہ میں بالکل فٹ ہو چکی ہوں؟"

"صبح ہو چکی ہے میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔ ہم بھوپال جائیں گے' وہاں تمہارے پتا جی آئیں گے۔ بھارت کے مشہور و معروف ڈاکٹروں میں ان کا نام آتا ہے۔ اتنے بڑے ڈاکٹر صاحب جب تمہیں صحت مندی کا سرٹیفکیٹ دیں تو تم اپنی ڈیوٹی........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "اوہ نو۔ پتا جی تو مجھے مہینوں آرام کرنے کا حکم دیں گے۔ دیکھو' میں تمہاری دھرم پتنی ہوں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں دن رات مصروف رہنے کی عادی ہوں۔ مجھے کام سے روکو گے تو بیمار پڑ جاؤں گی۔ میری بات کا یقین کرو یہاں سے بھوپال پہنچنے میں تین چار گھنٹے لگیں گے۔ اتنی دیر آرام کرنے کے بعد میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے' یہاں کسی مریض کو ہاتھ نہ لگانا۔ بلکہ کمرے سے باہر نہ جانا۔ میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔"

وہ اس کے بہت قریب ہو گیا۔ پھر جلدی سے دور ہو کر بولا۔ "سوری میں پھر بھول گیا تھا کہ ان حالات میں محبت بھی ایک واردات بن جاتی ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ شنکر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مسکراہٹ اڑ گئی' لبوں سے ایک سرد آہ نکلی۔ کیونکہ سہاگ رات کی صبح ہو چکی تھی۔

اس نے وعدہ کیا تھا کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔ کسی مریض کو اٹینڈ نہیں کرے گی۔ چونکہ کچھ کرنا نہیں تھا۔ اس لئے وہیں آرام سے لیٹ گئی۔ ڈاکٹر نے آکر پوچھا۔

"ڈاکٹر دیدی! آپ کیسی ہیں؟"

وہ اٹھ کر بولی۔ "بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا میری ضرورت ہے؟"

"جی نہیں۔ آپ آرام کریں۔ میں حال پوچھنے اور یہ دوا دینے آیا ہوں۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق یہ دوا تجویز کی ہے۔ آپ دیکھ لیں۔"

کامنا نے ہتھیلی پر مختلف قسم کی ٹیبلٹس لے کر دیکھیں۔ ڈاکٹر ایک گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے ان گولیوں کے نام بتا رہا تھا۔ کامنا نے ایک ٹیبلٹ کم کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں' باقی تم نے ٹھیک دوا دی ہے۔"

اس نے گولیاں نگل کر پانی پیا۔ ڈاکٹر خوش ہو کر شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔ وہ پھر لیٹنا چاہتی تھی مگر رک گئی۔ دروازے پر ایک خوبرو جوان کھڑا ہوا تھا۔ داڑھی بڑی ہوئی تھی' پاجامے اور کرتے پر گرم ویسٹ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کمرے میں آ کر پوچھا۔ "تم ہندو ہو یا مسلمان؟"

کامنا نے پوچھا۔ "یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟ کون ہو تم؟"

"اجی' یہی تو پتا نہیں چلتا' میں کون ہوں؟"

"کیا تمہاری یادداشت گم ہوگئی ہے؟"

"کیا گم ہوگئی ہے جی؟"

"کیا اپنے آپ کو بھول گئے ہو؟ زہریلی گیس کا شکار ہو؟"

"ہاں' وہ زہریلی گیس میری ناک میں آئی تھی۔ میں نے چھینک ماری' وہ باہر چلی گئی۔ میں اپنے آپ کو نہیں بھولا ہوں۔ وہ جیسا فلموں میں ہوتا ہے نا' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ابھی تم کہہ رہے تھے' تمہیں پتا نہیں چلتا کہ تم کون ہو۔"

"جی ہاں' یہی سمجھ میں نہیں آتا میں کون ہوں؟"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"امجد کمار۔"

"یہ کیسا نام ہے؟ تم ہندو ہو یا مسلمان؟"

اس نے اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "یہ ہوئی نا بات تم نے بھی وہی سوال کیا جو میں نے تم سے کیا تھا۔"

کامنا نے کہا۔ "میں ہندو ہوں۔"

"میں کس سے پوچھوں؟ میں آخر کون ہوں؟"

"اپنے ماں باپ سے پوچھو۔"

"میرے ماں باپ سری کرشن بھگوان کی پوجا کرتے ہیں۔"

"تو پھر تم ہندو ہوئے۔"

"مگر میری بیوی مجھے نماز پڑھاتی ہے۔"

"کیا!" کامنا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ شنکر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "چلو گاڑی آگئی ہے۔ کوئی ٹیکسی والا بھوپال جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے پانچ سو روپے دے کر راضی کیا ہے۔ آؤ۔"

وہ بولی۔ "ذرا ٹھہرو۔ تمہارے سامنے مینٹل کیس ہے۔ یہ اپنا نام امجد کمار بتاتا ہے ماں باپ سری کرشن بھگوان کی پوجا کرتے ہیں اور بیوی اسے نماز پڑھاتی ہے۔"

شنکر نے اسے غور سے دیکھا پھر پوچھا۔ "تمہارا پیدائشی نام کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ پیدا ہوتے وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ اپنا نام بھلا کیسے سنتا؟"

شنکر نے سر کھجاتے ہوئے کامنا سے کہا۔ "دیکھو' کتنی ذہانت کی بات کر رہا ہے۔ کوئی بچہ اپنا پیدائشی نام سن سکتا ہے۔ نہ سمجھ سکتا ہے۔ یہاں تک یہ ذہانت والی بات ہے' اس کے بعد کا جواب احمقانہ ہے۔ ہم بھی پیدائش کے وقت ناسمجھ تھے لیکن ماں باپ سے اور دنیا والوں سے سنتے سنتے یقین ہوا کہ تمہارا پیدائشی نام کامنا اور میرا پیدائشی نام شنکر ہے۔"

امجد کمار نے خوش ہو کر کہا۔ "اچھا تو تمہارا نام شنکر ہے۔ تم بھی میرے جیسے ہو۔ اچھا بتاؤ' ہندو ہو یا مسلمان ہو؟"

شنکر نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "دوست' میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ورنہ میں تمہاری اسٹڈی کرتا' چلو کامنا۔"

وہ بولی۔ "پتا نہیں' یہ کون ہے؟ کوئی اس کے آگے پیچھے ہے یا نہیں؟ اسے توجہ کی ضرورت ہے۔"

"تم ڈاکٹر سے کہہ دو۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے گا۔"

اسی وقت ڈاکٹر آ گیا۔ امجد کمار کو دیکھ کر بولا۔ "ارے' تم بستر سے بھاگ کر یہاں آئے ہو۔ چلو' اپنے بیڈ پر جاؤ۔"

"نہیں جاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ تمہاری بیوی تمہیں نماز پڑھاتی ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ یہ جب سے آیا ہے' ہندو مسلمان کا چکر چلا رہا ہے۔"

کامنا نے کہا۔ "مجھے اس پر ترس آ رہا ہے۔ ڈاکٹر! اس سے محبت سے پیش آنا۔ اگر کنٹرول سے باہر ہو تو بھوپال ہمارے پاس بھیج دینا۔"

وہ امجد کمار کو مسکرا کر دیکھتی ہوئی شنکر کے ساتھ باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"میرے بھائی' اپنے بیڈ پر چلو۔"

"خبردار! مجھے بھائی نہ کہنا۔ پہلے بتاؤ تمہارا ایمان کیا ہے اور دھرم کیا ہے؟"

"میں دوسرے مریضوں سے نمٹنے کے بعد جواب دوں گا۔ ابھی چلو۔"

وہ اس کے ساتھ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آیا۔ اسپتال کے باہر ایک گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کی بے ہنگم آوازیں نکال رہا تھا۔ امجد کمار نے اچھل کر باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ "ابے چپ! چپ ہو جا۔ بھوپال کی گیس کو ادھر بلا رہا ہے۔ جان سے مار ڈالوں گا۔"

وہ دوڑتا ہوا جانے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "ارے پکڑو' اسے پکڑو۔ اسے جانے نہ دینا!"

وہ دوڑتا ہوا اسپتال کے باہر آیا پھر گدھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "لوگو' ذرا دیکھو۔ میں نے عید میں نئے جوڑے بنا کر دیئے' دسہرے اور دیوالی میں بھی نئے جوڑے دیئے مگر ہے نا آخر گدھا۔ سب کے سامنے ننگا چلا آیا۔"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ کامنا اور شنکر ٹیکسی میں بیٹھ گئے تھے۔ ڈرائیور اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا رہا تھا۔ شنکر نے کہا۔ "ذرا رک جاؤ۔ یہ بہت ہی دلچسپ مینٹل کیس

ہے۔ آخر یہ جوان کون ہے؟"

سکھ ڈرائیور نے کہا۔ "میں اسانو چنگی طرح جانتا۔ یہ وڈا رائٹر ہے۔ اخباراں میں وڈا نام ہے۔ اس نے بھوپال گیس کے خلاف کئی بار لکھا۔ پولیس والے چک کر لے گئے تھے۔"

ادھر گدھا بدک کر بھاگنا چاہتا تھا۔ امجد کمار چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس کی پشت اور گردن سے لپٹ گیا۔ گدھا اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ "بھاگنے نہیں دوں گا۔ الو کے پٹھے! گدھے کے بچے! کپڑے نہیں پہنتا ہے۔ کیا ننگا رہنے سے پہچان ہو جائے گی کہ ہندو ہے یا مسلمان؟ میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔ تجھے منہ سے بولنا ہو گا چل' سب کے سامنے بتا۔ ہندو ہے یا مسلمان؟"

شنکر نے کہا۔ "اوہ گاڈ! یہ ہر ایک سے یہی سوال کرتا ہے۔ دھرم کے معاملے میں انسان اور گدھے کو ایک ہی سمجھتا ہے۔ میں علم نفسیات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں' اس کے سوال کے پیچھے گہرے زخم چھپے ہوئے ہیں۔ آئی ہیو ٹو فائنڈ اٹ آؤٹ۔"

پھر اس نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔ "ڈاکٹر! اسے کسی طرح بھوپال بھیج دو۔ میں اسے پرسنل اٹینڈ کروں گا۔"

اس نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

☆------☆------☆

دوسرے دن بھوپال شہر انسانوں سے خالی نظر آ رہا تھا۔ انسان تو انسان کسی کیڑے مکوڑے کا وجود بھی نہیں تھا۔ کسی جانور کی آواز تک نہیں تھی۔ تمام جھونپڑیاں اور کچے پکے مکانات' دکانیں اور عمارتیں قبروں کی طرح چپ تھیں۔ جن علاقوں میں زہریلی گیس نہیں پھیلی تھی وہاں کے لوگ بھی اپنے مکانوں اور دکانوں کو مقفل کر کے بھاگ گئے تھے۔ متاثرہ علاقوں میں سڑکوں پر اور گلیوں میں گائیوں' بھینسوں کتوں اور بلیوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں۔ انہیں آبادی سے دور لے جا کر پھینکنے والے ڈوم چمار بھی شہر چھوڑ گئے تھے۔

جن علاقوں سے گیس گزر رہی تھی' اب وہاں کی فضا زہریلی نہیں رہی تھی پھر بھی پولیس اور فوج نے اُدھر کا رخ نہیں کیا۔ فوجیوں نے شہر کے دوسرے حصوں میں ساتھ

خیمے لگائے۔ ہر خیمے میں گیس متاثرین کو علاج کے لئے رکھا گیا۔ مُردہ خانے کے طور پر بھی خیمے لگائے تاکہ لوگ وہاں جاکر اپنے مرنے والے عزیزوں اور دوست احباب کی شناخت کرسکیں۔

ہندو لاشوں کی الگ الگ چتا جلانے کے لئے ہزاروں من لکڑیاں دستیاب نہیں ہوسکتی تھیں۔ لہٰذا ایک چتا میں پانچ چھ لاشیں جلائی جاتی تھیں۔ جگہ جگہ چتائیں جلنے کا عجیب سماں تھا۔ تمام رات آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے آسمان کی طرف جاتے تھے اور دور تک زمین پر موت کا چراغاں کرتے تھے۔

مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ نہیں تھی۔ میتیں آتی ہی چلی جاتی تھیں۔ علماء نے حالات کے پیشِ نظر فتویٰ دیا' کئی لاشیں ایک وسیع و عریض قبر میں دفنائی جاسکتی ہیں اور بہت زیادہ پرانی قبروں کو دوبارہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے چھ فٹ لانبی اور پندرہ فٹ چوڑی قبریں کھودی جاسکتی تھیں۔ ان میں جتنے شہید سماتے تھے' انہیں سپرد خاک کردیا جاتا تھا۔ راتوں کو گیدڑ اور مردار کھانے والے کتے اس تاک میں رہتے تھے کہ کوئی قبر گہری نہ ہوتو وہ خوراک حاصل کرسکیں۔ دن کو مردار کھانے والے گدھ' جانوروں کی لاشوں پر منڈلاتے رہتے تھے۔

حمیدیہ اسپتال میں متاثرین کا بے پناہ ہجوم تھا۔ بیڈ کی گنجائش نہیں تھی۔ مریض وارڈ اور کوریڈور کے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے کا برآمدہ اور لان کا حصہ بھی خالی نہیں تھا۔ ایک ہندی اخبار کا رپورٹر اروِن ورما اپنی گردن سے ایک چھوٹا کیسٹ ریکارڈر لٹکائے' ہاتھ میں مائیک لئے معلومات حاصل کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے ایک ڈاکٹر کے سامنے چلتے ہوئے مائیک اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں' آپ بہت مصروف ہیں۔ میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ آپ مریضوں کو اٹینڈ کرتے رہیں اور میرے چند سوالوں کے جواب دیتے رہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں یہاں ہزاروں متاثرین تکلیف میں مبتلا ہیں۔ آپ کس طرح ہر ایک پر مناسب توجہ دیتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تین سو پچاس ڈاکٹر ایک ہزار نرسیں اور پانچ سو میڈیکل کے طالب علم فوری طبی امداد کے لئے پہنچ گئے ہیں۔ دوائیں بھاری مقدار میں آرہی ہیں۔ ہمارے

اسپتال میں ساڑھے سات سو بستر ہیں جو ناکافی ہوگئے' مریض راہداریوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں' ہمیں چلنے پھرنے کی جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ ایسے میں اخباری رپورٹر اور فوٹوگرافر بہت پریشان کرتے ہیں۔ پلیز! آپ چلے جائیں' ہمیں کام کرنے دیں۔"

وہ ایک مریض کو دیکھنے لگا۔ رپورٹر اروِن ورما ایک کمرے میں آیا۔ وہ کمرا ڈاکٹروں کے لئے مخصوص تھا۔ مگر وہاں خاص طور پر ایک بیڈ لاکر رکھا گیا تھا۔ اس پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص لیٹا ہوا تھا۔ اروِن ورما نے اس کے سامنے مائیک لے جاکر کہا۔ "نمستے شریمان! آپ کو تمام لوگوں سے دور اور سب سے الگ تھلگ رکھا گیا ہے۔ کیا آپ اس ملک کے نیتا ہیں یا کسی کانگریسی کے رشتے دار ہیں؟"

اس شخص نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "ہم خاندانی کانگریسی ہیں۔ میرا بھائی ہیلتھ منسٹر ہے۔ میں بھوپال میں دواؤں کا سول ایجنٹ ہوں۔ میرا نام رام داس گوکھلے ہے۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ جب آپ نے میتھائل ایسوسائٹ کی بو محسوس کی تو آپ اس وقت کہاں تھے اور کیا کررہے تھے؟"

"میں ناگپور سے بیٹے اور بہو کی بارات لے کر یہاں کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ جب بہو کو کمپارٹمنٹ سے اتارا گیا تب ہی میں نے پہلی بار وہ زہریلی گیس محسوس کی۔"

"ایسے میں آپ نے اور باراتیوں نے کیا کیا؟"

"اگرچہ میں بچاؤ کی فوری تدبیر جانتا ہوں لیکن اس سے بوکھلا گیا تھا۔ دراصل بیٹے نے میری مرضی کے خلاف شادی کی۔ میں ایک منسٹر کی بیٹی کو بہو بنانے کی بات پکی کرچکا تھا مگر بیٹے کی ضد کے سامنے جھکنا پڑا۔ وہ میڈیکل بورڈ کے ایک ڈائریکٹر کی بیٹی کو لے آیا ہے۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ جب بہو نے پہلی بار بھوپال کی زمین پر قدم رکھا تو مجھے موت نظر آئی۔ میں نے باراتیوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر گر کر مرتے دیکھا۔ اس سے غصہ بھی تھا اور بدحواسی بھی تھی۔ اس لئے فیکٹری کی گیس کو سمجھ نہ سکا۔ بیٹے کو بھاگنے کے لئے کہا پھر خود بھاگتا ہوا اسٹیشن کے باہر آیا۔ میرا وفادار ڈرائیور میرے لئے گیلا کپڑا

لے کر آیا۔ اسے میں نے چہرے پر رکھا تو اطمینان سے سانس لینے لگا۔"

"کیا اس سے پہلے آپ نے سانس روکی ہوئی تھی؟"

"میں جوانی سے یوگا کی مشقیں کرتا آیا ہوں۔ پانچ منٹ تک سانس روک سکتا ہوں۔ جب ڈرائیور نے منہ پر گیلا کپڑا رکھا تب میتھائل ایسوسائٹ کا خیال آیا۔ میں نے ڈرائیور سے دوسرا گیلا کپڑا لانے کو کہا پھر واپس بھاگتا ہوا پلیٹ فارم پر آیا۔ اس وقت ٹرین جارہی تھی۔ مجھے بیٹا نظر نہیں آیا۔ میں نے دور تک لاشوں کے درمیان دیکھا۔ دلہا دلہن دور سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ وہ پلیٹ فارم پر نہیں تھے۔ میں نے دل کو تسلی دی۔ وہ ٹرین میں چلے گئے ہیں یا کسی دوسری طرف نکل گئے ہیں۔ آج صبح اسپتال کے ایک کلرک نے بتایا' وہ دونوں یہاں سے پچیس میل دور خیریت سے ہیں۔"

"آپ نے زہریلی گیس میں برائے نام سانس لی' آپ کو متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اسپتال میں کیوں ہیں؟"

"کوئی اسپتال اور شمشان گھاٹ شوق سے نہیں جاتا۔ اس گیس سے میری آنکھیں اور میرا دماغ متاثر ہوا ہے۔ مجھے جلدی غصہ آجاتا ہے۔ تم یہاں سے جاؤ۔ ورنہ غصے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"میں آپ کے دل کی بات کہوں گا تو غصہ نہیں آئے گا۔"

"میرے دل کی وہ بات کیا ہے؟"

"یہی کہ جو اولاد آپ جیسے باپ کی بات نہیں مانتی اس پر بلا نازل ہوتی ہے۔"

"بے شک' وہ بہو نہیں بلا ہے۔ اپنے ساتھ موت لے کر آئی ہے۔ پتا ہے' وہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ میرا بیٹا کہتا ہے' وہ لوگوں کو زندگی دیتی ہے۔ اب بچو رام سے پوچھوں گا تیری عورت موت کیسے دے رہی ہے!"

"ضرور پوچھئے۔ ایسی بہو کے خلاف آواز اٹھانا آپ کا حق ہے۔ حکومت تحقیق کرائے گی کہ گیس کیسے خارج ہوئی۔ ماہرین اور اخبار والے طرح طرح کی وجہ بیان کریں گے لیکن اصل وجہ تو آپ کو معلوم ہے یا مجھے معلوم ہے۔ ہمارا کل کا اخبار پڑھئے گا۔ ہم جلی حرفوں سے دعوے کے ساتھ یہ حقیقت شائع کریں گے کہ ایک منحوس بہو کے قدم

رکھتے ہی فیکٹری کی گیس خارج ہوگئی۔"

"آں؟" وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "یہ۔ یہ اخبار میں نہ لکھنا۔"

"کیوں نہ لکھوں؟"

"یہ کوئی ماننے والی بات نہیں ہے لوگ مذاق اڑائیں گے۔"

"چلئے کوئی بات نہیں۔ ہم یہ نہیں لکھیں گے کہ بہو کے قدم رکھنے سے گیس خارج ہوئی۔ گیس تو ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے نکلی لیکن وہ تو لوگوں کی بھلائی کے لئے نکلی تھی' منحوس بہو کے قدم رکھتے ہی لوگوں کو مچھر اور کھٹمل کی طرح مارنے لگی۔ ہم دعویٰ کریں گے کہ ایسی بہو کو بھوپال سے تڑی پار کرایا جائے۔"

"اے! تم کیسی بات کررہے ہو۔ کیا وہ زہریلی گیس لوگوں کی بھلائی کے لئے نکلی تھی۔ تم کوئی رپورٹر ہو یا پاگل؟"

"یعنی آپ مانتے ہیں کہ گیس ٹیکنیکل خرابی کے باعث خارج ہوئی اور وہ گیس کسی خوش نصیب یا بدنصیب بہو کا لحاظ کئے بغیر سب کو ہلاک کرتی ہے۔"

"اے' بکواس مت کرو! جاؤ یہاں سے وہ منحوس ہو یا نہ ہو' میرے تو نصیب پھوٹ گئے۔"

"میں ثابت کروں گا آپ کے نصیب سونے چاندی کے ہوگئے ہیں۔ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے' عورت لکشمی ہے اس کے آنے سے دولت آتی ہے۔ آپ ذرا غور فرمائیں۔ آپ پورے شہر میں دواؤں کے سپلائر ہیں۔ بہو کے آتے ہی صرف ایک دن میں دو چار لاکھ روپے کی دوائیں سپلائی ہوچکی ہیں۔ یہ دواؤں کی کمپنیاں آپ کو کمیشن ضرور دیں گی۔ پھر یہ تو دو چار روز کے لئے طبی امداد کا کام ہورہا ہے۔ زہریلی گیس کا اثر مہینوں تک رہے گا۔ آپ کی لیڈی ڈاکٹر بہو کے پاس مریضوں کی بھیڑ لگی رہے گی۔ روز نوٹوں کی گڈیاں بنتی جائیں گی۔ آپ کی تو چاندی ہی چاندی ہے۔ بہو لکشمی ہے لکشمی۔"

"تم کبھی الٹی بات کرتے ہو کبھی سیدھی بات کرتے ہو۔ آخر کیا چیز ہو؟"

"میں اخبار والا ہوں۔ ہوا کا اور سیاست کا رخ دیکھ کر بات بدلتا ہوں۔"

ایک ادھیڑ عمر کا شخص کمرے میں داخل ہوا اسے دیکھتے ہی رام داس گو کھلے بستر سے

اٹھ کر بیٹھ گئے۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے۔ "سمدھی جی آپ؟ آئیے' میں جانتا تھا' آپ ہماری خبر لینے آئیں گے۔"

وہ آکر رام داس گوکھلے کے گلے لگتے ہوئے بولے۔ "پہلے خوشخبری سن لیجئے' آپ کا بیٹا اور بہو خیریت سے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہو چکا ہے۔"

وہ رام داس سے الگ ہو کر بولے۔ "یہ آپ کے سینے اور پیٹ میں کیا ہے۔ گلے لگتے وقت کچھ محسوس ہو رہا تھا۔"

"یہ......... یہ سونے کے زیورات ہیں۔ آپ نے بنی کو پچاس تولے جہیز دیئے تھے۔ میں نے وہیں ناگپور میں صدری کے اندر سلوا کو پہن لئے تھے میری دور اندیشی دیکھئے۔ ایسا نہ کرتا تو بہت بڑا نقصان ہو جاتا.......... جہیز کا تمام سامان چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ یہ پچاس تولے بھی وہیں رہ جاتے۔"

رپورٹر ارون ورما نے کہا۔ "کمال ہے صاحب! کیا دور اندیشی ہے۔ کیا پچاس تولے لانے والی کو بھی اسی طرح کلیجے سے لگا کر لائے ہیں؟"

"ایں؟" رام داس گڑبڑا گئے پھر غصے سے بولے۔ "تم ابھی تک یہیں ہو! جاؤ یہاں سے گیٹ آؤٹ.........."

دو فوجی جوان تیزی سے اندر آئے۔ ایک نے ڈاکٹروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ سب اپنی ڈیوٹی پر رہیں۔ پردھان منتری راجیو گاندھی تشریف لا رہے ہیں۔ یہاں صفائی کا خاص خیال رکھیں۔"

فوجی جوان وہاں سے جانے لگے۔ ارون ورما نے جلدی سے قریب آکر مائیک سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "آپ پردھان منتری کو پہلے سے آگاہ کر دیں' وہ ناک پر رومال رکھ کر آئیں۔"

فوجیوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بولا۔ "غصے کی بات نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں' ہزاروں مریضوں کے درمیان صفائی ممکن نہیں ہے یہ اٹھنے بیٹھنے سے لاچار ہیں۔ لیٹے ہی لیٹے غلاظت نکال دیتے ہیں۔ وارڈ بوائے اور مہتر ایک طرف سے صفائی کرتے جاتے

ہیں' اور دوسری طرف سے پھر گندگی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں کا سنڈاس دیکھنے کے قابل ہے۔ کوئی ناک پر رومال رکھ کر بھی نہیں جا سکتا۔"

ایک جوان نے کہا۔ "کتے کی طرح بھونکنا بند کرو اور اسپتال سے باہر جاؤ۔"

"مجھے تو آپ کے بڑے افسر بھی نہیں نکال سکتے۔ یہ ناچیز ہندی اخبار "جن ستیا" کا رپورٹر ہے۔"

اس نے اپنا کارڈ دکھایا۔ وہ ناگواری سے دیکھ کر چلے گئے۔ ارون ورما نے اپنے کارڈ کی طرف اشارہ کر کے رام داس گوکھلے سے کہا۔ "یہ مجھے کہہ رہے تھے' کتے کی طرح بھونکنا بند کرو۔ یہ ساری باتیں ریکارڈ ہو چکی ہیں اور وہ منحوس قدم اور پچاس تولے والی باتیں بھی اخبار کے لئے دلچسپ کہانی بنائیں گی۔"

رام داس گھوکھلے نے گھبرا کر ریکارڈر کو دیکھا۔ ارون ورما کمرے سے باہر آ گیا۔ برآمدے میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ فوجی افسران حکم دے رہے تھے کہ برآمدے میں پڑے ہوئے مریضوں کو اٹھا کر اسپتال کے پیچھے ڈال دیا جائے۔ پردھان منتری کے گزرنے کے لئے راستہ صاف ہونا چاہئے۔ اسپتال کے تمام فرش کو فنائل سے دھو کر تھوڑی خوشبو اسپرے کی جائے۔ جو مریض کھڑے ہونے کے قابل تھے انہیں زبردستی چلا کر لے جایا جا رہا تھا۔ باقی کو اسٹریچر وغیرہ پر ڈال کر اسپتال کے پیچھے پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کے رونے اور کراہنے کی آوازوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک افسر بتا رہا تھا کہ وزیر اعظم راجیو گاندھی کو اسپتال کے کون کون سے حصے میں لے جایا جائے گا۔ اس کے مطابق دستاویزی فلم بنانے والے سرکاری کیمرا مین اور ٹی وی سے تعلق رکھنے والے کیمرا مین بجلی کے تار بچھا رہے تھے۔ بھارتی انٹیلی جنس والے' دشمن عناصر کو سونگھتے پھر رہے تھے۔ مریضوں کے بستروں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ کسی نے خطرناک اسلحہ چھپا رکھا ہو گا۔

ایک گھنٹے بعد وزیر اعظم راجیو گاندھی تشریف لائے۔ لوگوں کی جے جے کار سنتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر اسپتال میں داخل ہوئے۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر دور تک دیکھا پھر کہا۔ "سردی کا موسم ہے اور یہ بے چارے کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہیں۔ کیا ان کے

لئے کوئی چار دیواری نہیں ہے؟"

ایک افسر نے بتایا۔ "اسپتال میں گنجائش نہیں ہے۔ فوجی خیموں میں بھی مریض گنجائش سے زیادہ ہیں۔"

انہوں نے فرمایا۔ "اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زہریلی گیس سے بچنے والے سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں۔ انہیں ایک گھنٹے کے اندر اسکول کی چار دیواری میں پہنچایا جائے۔ وہاں بھی دواؤں' ڈاکٹروں اور نرسوں کو چوبیس گھنٹے موجود رہنا چاہئے۔"

وہ ایک وارڈ میں آئے' چند ایک مریضوں سے خیریت پوچھی' انہیں دلاسا دیا۔ ایسا کرتے وقت ان کی تصویریں اور فلمیں تیار ہو رہی تھیں۔ اخباری رپورٹروں کو قریب جاکر سوال کرنے سے روکا جارہا تھا۔ ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ اس سلسلے میں پریس کانفرنس بلائی جائے گی۔ وہاں سوالات کئے جاسکتے ہیں۔

انہوں نے اپنے اس دورے کی کارروائی مکمل کرانے کے لئے اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ "یہ جو اچانک حادثہ پیش آیا ہے' اس کا اثر میرے دل و دماغ پر ہے۔" انہوں نے اپنے طور پر بیان دیا۔ ارون ورما نے آگے بڑھ کر بلند آواز میں کہا۔ "یہ حادثہ اچانک پیش نہیں آیا ہے۔ جب سے یہ فیکٹری قائم ہوئی ہے تب سے چھوٹے چھوٹے حادثات کسی بڑے حادثے کی وارننگ دیتے رہے ہیں۔ محترم وزیراعظم! ۲۴ دسمبر ۱۹۷۸ء کو ٹنکی سے تھوڑی گیس خارج ہوئی تھی۔ اس رات خوف کے مارے کوئی سو نہ سکا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۱ء میں پھر خرابی ہوئی اور ایک مزدور اشرف مارا گیا۔ اس کے پندرہ دن بعد پھر گیس خارج ہوئی جس سے فیکٹری کے ورکر اور شہر کے کئی لوگ متاثر ہوئے..........."

وہ بے تحاشا بول رہا تھا۔ راجیو گاندھی چپ چاپ سن رہے تھے۔ انٹیلی جنس اور فوج کے افسران ارون ورما کو گھور کر دیکھ رہے تھے۔ وہ بے باکی سے کہہ رہا تھا۔ "جناب عالی! ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی آدھی رات کو گیس پائپ کہیں سے ٹوٹ گیا' ۱۹۸۳ء میں دوبار چھوٹے حادثے ہوئے' ۱۹۸۴ء میں ارون ماتھر نامی ایک ورکر مارا گیا۔ ہر بار مزدور یونین نے آواز اٹھائی۔ اخبارات نے اس بڑے خطرے سے آگاہ کیا جو آج پیش آیا لیکن آپ کے کرم چاریوں نے ہر حادثے کے نتائج کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ کیا آپ یقین دلا کر

جائیں گے کہ آج کے بعد یہ زہریلی گیس کسی کو نہیں مارے گی؟"

وزیراعظم راجیو گاندھی نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں یقین دلاتا ہوں اور سختی سے یہ حکم دے کر جارہا ہوں کہ فی الحال یہ فیکٹری بند کردی جائے۔ اس فیکٹری کی مالک امریکن یونین کاربائیڈ کمپنی ہے۔ بھارتی حکومت کی طرف سے اس پر مقدمہ چلایا جائے گا اور ہماری متاثر ہونے والی ایک ایک ماں' ایک ایک بہن اور ایک ایک بھائی کو اس سے بھرپور معاوضہ دلایا جائے گا۔ ہم اس قاتل کمپنی کو معاف نہیں کریں گے۔"

تمام لوگ تالیاں بجانے لگے۔ راجیو گاندھی دونوں ہاتھ جوڑ کر تالیوں کی گونج میں واپس چلے گئے۔ وہ جو کہہ گئے تھے اس سے زیادہ تسلی کے لئے اور کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ بھارت میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ اندرا کانگریس مشکل میں پڑ گئی تھی۔ مخالف سیاسی جماعتیں ان سے استعفا دینے کا مطالبہ کررہی تھیں۔ سیاسی مبصرین نے رائے پیش کی کہ مخالفت کمزور ہے کیونکہ کمیونسٹ پارٹی کو چھوڑ کر باقی تمام سیاسی پارٹیاں امریکا کی جی حضوری کرتی تھیں۔ وہ زہریلی گیس بنانے والی یونین کاربائیڈ کمپنی کے خلاف کھل کر بیانات نہیں دے سکتے تھے کیونکہ امریکا کی مختلف فیکٹریوں سے ان کے کاروباری تعلقات تھے۔ حالات بہت زیادہ بگڑنے کے باوجود راجیو گاندھی کے موافق تھے۔

اسپتال میں پھر وہی پہلے جیسی افراتفری اور بے ترتیبی پھیل گئی۔ ارون ورما نے سر تھام کر سوچا یہ تو کچھ نہ ہوا۔ وزیراعظم نے فی الحال فیکٹری بند رکھنے کی بات کی۔ فیکٹری ختم کرنے کی بات نہیں کی۔

وہ مائیک اور کیسٹ ریکارڈر سنبھالتا ہوا ایک وارڈ میں آیا۔ وہاں عورتیں تھیں ایک خوبصورت سی عورت بستر کے سرہانے تکیے سے ٹیک لگائے خلا میں تک رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا۔ عورت نے اچانک ہی ڈانٹ کر کہا۔ "خبردار!"

وہ اچھل پڑا۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "میں خبردار ہوں۔ آپ کو بہن سمجھ کر کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

"نہیں۔ میرے قریب نہ آنا۔ پہلے بتاؤ' ہندو ہو یا مسلمان؟"

"میں ہندو ہوں۔"

"دور ہو جاؤ' میری نظروں سے۔ تم لوگوں نے میرے شوہر کی نمازیں چھین لیں' اس سے اس کا ایمان بھی چھین لیا اور دھرم بھی۔ نہ وہ ہندو رہا نہ مسلمان۔"

"بہن جی! آپ کیا کہہ رہی ہیں' میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کے شوہر کا نام کیا ہے؟"

"امجد کمار سکینہ۔ آہ! پتا نہیں' وہ کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔"

وہ رونے لگی۔ اپنے آنچل سے آنکھوں کو ڈھانپ کر بولی۔ "میں انہیں تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ کئی بار اٹھنے کی کوشش کی مگر چند قدم چل کر ہانپنے لگی ہوں۔ میرے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں' آنکھیں دکھنے لگی ہیں۔ کتنی عورتیں اندھی ہو رہی ہیں۔ میں دعا کرتی ہوں' آنکھوں کی روشنی بجھنے سے پہلے ایک بار انہیں دیکھ لوں۔"

ارون ورما اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "آپ امجد کمار سکینہ کی وائف ہیں۔ وہ تو عظیم صحافی ہیں۔ ایسے ایسے دلائل کے ساتھ سیاستدانوں کی دھجیاں اڑاتے ہیں کہ کوئی ان کے سیاسی مضامین کی تردید نہیں کر پاتا۔ آپ مہان لیکھک کی پتنی ہیں۔ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔"

"پرنام نہیں سلام کرو۔"

"اچھا' سلام کرتا ہوں۔ مگر آپ تعصب کی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟"

وہ بولی۔ "میرے منہ میں ایک غیر جانبدار زبان تھی۔ اس میں تمہارے لوگوں نے تعصب بھر دیا۔"

کیا آپ بتانا پسند کریں گی' ایسا کن لوگوں نے کیا۔ میں آپ کے پتی کا فین ہوں' ان کے قلم کو پوجتا ہوں۔"

"جن کو تم پوجتے ہو' وہ پاگل ہو چکے ہیں۔"

"کیا! نہیں بھائی۔ آپ میری ماں سمان ہیں۔ مجھے بتائیں' یہ سب کیسے ہوا؟"

وہ بھیگی آنکھوں سے خلاء میں تکنے لگی۔

اس کے کانوں میں شہنائیاں بج رہی تھیں۔ وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ دلہن بن

کر امجد کے ساتھ پہلی بار بھوپال آئی تھی۔ دہلی سے بھوپال پہنچنے تک امجد نے ٹرین میں اس سے کہا۔ "تمہیں میکے میں یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہندو ماں باپ نے میری پرورش کی ہے۔ میں نے اپنے والدین کو کبھی نہیں دیکھا۔ میرے پتا جی کہتے ہیں وہ ابو کے بہت گہرے دوست تھے۔ جب میں ایک ماہ کا تھا تو دہلی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے میرے والدین مارے گئے۔ پتا جی مجھے اپنے گھر لے آئے۔ ان کے ہاں کبھی اولاد نہیں ہوئی۔ ماں نے مجھے بھگوان کی دین سمجھ کر کلیجے سے لگا لیا۔ یہ ان کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے مجھ سے میری اصلیت نہیں چھپائی یہ بات مجھے ذہن نشین کراتے رہے کہ میں مسلمان ہوں۔"

وہ اپنے متعلق بتا رہا تھا۔ یہ سن رہی تھی۔ اس کے پتا جی کا نام موہن کمار سکینہ تھا اور والد کا نام احمد یار خان تھا۔ جب وہ چار برس کا ہوا تو انہوں نے مسجد کے مولوی صاحب سے کہا۔ "آپ اسے اپنے دین ایمان کی باتیں سمجھائیں۔ اگر میرے ہاں روز آ کر اسے قرآن شریف پڑھا دیا کریں تو مہربانی ہوگی۔"

مولوی صاحب نے کہا۔ "موہن بھائی! آپ کچھ خیال نہ کریں۔ آپ کے گھر میں آپ کے بھگوان کی مورتیاں ہیں۔ میں ایسی جگہ لڑکے کو اللہ کا کلام نہیں پڑھا سکتا۔ آپ اسے روزانہ نہلا دھلا کر مسجد میں بھیج دیا کریں۔"

موہن کمار سکینہ نے کہا۔ "آپ یہی چاہتے ہیں تو میں اسے مسجد تک پہنچا دیا کروں گا۔"

مولوی صاحب نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے' اس یتیم لڑکے کو مسلمانوں کے یتیم خانے میں داخل کر دیں۔ بچوں پر ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ وہ یتیم خانے میں ہی سہی' مسلمانوں کے ماحول میں رہے گا تو اپنے دین اور تہذیب سے زیادہ متاثر ہوگا۔"

"آپ اپنے نکتہ نظر سے درست کہتے ہیں لیکن یہ میرے دوست کی امانت ہے۔ مجھ بے اولاد کے گھر کی رونق ہے۔ میں اسے خوب پڑھا لکھا کر ایک قابل انسان بناؤں گا۔ اسے ہم سے ماں باپ کی بھرپور محبت ملے گی۔ یہ یتیم خانے میں محبتوں سے محروم ہو کر احساسِ کمتری میں مبتلا رہے گا۔ آپ اطمینان رکھیں' میں یہ الزام اپنے سر نہیں لوں گا کہ یہ میرے سائے میں رہ کر مسلمان نہ رہ سکا۔"

آدمی خود اپنی نیت سے اچھا یا برا ہوتا ہے۔ موہن کمار سکسینہ نے بہت بڑی ذمے داری اپنے سرلی تھی چونکہ ان کی نیت صاف تھی اس لئے وہ نہایت دیانتداری سے اپنا فرض پورا کرتے رہے۔ امجد نے ہوش سنبھالتے سنبھالتے پوجا پاٹ کا ماحول دیکھا تھا۔ اس نے ابتدا ہی سے ہندوانہ طور طریقے دیکھے تھے۔ اس کے کان نمستے' جے رام جی کی اور ہائے لاگوں' جیسے الفاظ سنتے تھے۔ ماں جی کو کوئی تکلیف پہنچتی یا پتا جی کو کبھی ٹھوکر لگتی تو وہ بے اختیار "ہے بھگوان" کہتے تھے۔ اپنی خوشحالی کے بارے میں کہتے تھے۔ یہ سب بھگوان کی کرپا ہے۔

امجد یہ سب کچھ دیکھتا تھا' سنتا تھا۔ غیر شعوری طور پر یہ باتیں اس کے ذہن میں نقش ہوتی تھیں۔ شعوری طور پر پتا جی سمجھاتے تھے۔ "بیٹے! جب ہم پوجا کریں تو تم اپنی کتابیں پڑھا کرو۔ نمستے نہیں' آداب کہو۔ امتحان میں کامیابی ہو تو کہو۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔"

وہ نہایت دیانتداری سے سمجھاتے تھے لیکن بچہ اپنے بزرگوں کا اثر لیتا ہے۔ خصوصاً جنہیں ماں باپ سمجھتا ہے' ان کے ہر عمل سے اور ہر قول سے متاثر ہوتا ہے۔ ماں جی صبح اٹھ کر بڑے ترنم سے گیتا پڑھتی تھیں۔ امجد کو ان کی آواز بہت پیاری لگتی تھی وہ گود میں بیٹھ جاتا تھا۔ پتا جی نے یہ دیکھا تو سوچ میں پڑ گئے۔ ایک دن انہوں نے صبح سویرے امجد کے سرہانے ریڈیو لاکر رکھا اور وہ اسٹیشن لگادیا۔ جہاں سے کلام پاک کی آیتیں قرأت سے سنائی جارہی تھیں۔ انہوں نے تاکید کی بیٹے! روز صبح اٹھ کر اسے سنا کرو۔

بے شک موہن کمار سکسینہ پوری ذمے داری اور توجہ سے اپنا فرض ادا کررہے تھے لیکن ایک ماں میں اور ریڈیو میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ریڈیو مخصوص وقت میں بول کر چپ ہوجاتا ہے۔ ماں کی ممتا چپ رہ کر بھی بچے کے لاشعور میں بولتی رہتی ہے۔ جب وہ دس برس کا ہوا تو ایک دن پوجا کے دوران آکر بیٹھ گیا۔ پتا جی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

اس نے بھگوان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں بھی پوجا کروں گا۔"

بیٹے! میں تو تمہیں مسجد میں بھیجا کرتا ہوں۔ وہاں تم نماز پڑھتے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ جو کرتے ہیں' وہ مجھے کیوں نہیں کرنے دیتے۔ کیا یہ میرے لئے پاپ ہے؟"

"یہ تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔ تم مسلمان ہو۔ ہم تمہیں وہی سکھاتے ہیں جو تمہارا خدا کہتا ہے۔"

"جو بھگوان کہتا ہے' وہ کیوں نہیں سکھاتے؟"

"تم ذرا اور بڑے ہوجاؤ تو ہماری باتیں سمجھ میں آئیں گی۔ اچھے بچے اپنے بڑوں کی باتیں مانتے ہیں۔ تم ہمارے بہت اچھے بیٹے ہو۔ بحث نہ کرو' جو کہتے ہیں' وہ کرو۔"

اس نے سولہ برس کی عمر میں میٹرک پاس کیا پھر کالج میں داخلہ لیا۔ موہن کمار سکسینہ اب ہندی اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اپنے بیٹے کو بھی جرنلسٹ بنانا چاہتے تھے۔ اس نے سیکنڈ ایئر میں پڑھنے کے دوران ملک کے سیاسی حالات پر ایک مضمون لکھا پھر اخبار کے دفتر میں آکر اپنے پتا جی کے سامنے وہ مسودہ رکھ دیا۔ "میں نے ایک مضمون لکھا ہے۔ اسے چھپوانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اسے چھاپنا پسند کریں گے؟"

انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "یہ تمہارا پہلا مضمون ہے۔ میں تمام کام چھوڑ کر پڑھوں گا۔ دیکھوں تو سہی' میرے بیٹے نے کیا لکھا ہے۔"

وہ بچپن ہی سے ذہین تھا۔ جماعت میں اول آتا تھا۔ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے اور لکھنے میں پتا جی کی نقل کرتا تھا۔ یوں نقل کرتے کرتے وہ دوسرا موہن کمار سکسینہ بن گیا تھا۔ پتا جی نے مضمون پڑھ کر حیرانی سے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ اتنا مدلل اور جامع مضمون تم نے لکھا ہے۔"

اس نے کہا۔ "شاید آپ کو نہیں معلوم میں موہن کمار سکسینہ کا بیٹا ہوں۔"

پتا جی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "ارے ہاں' یہ تم نے مضمون کے نیچے امجد کمار سکسینہ کیوں لکھا ہے؟"

"اس لئے کہ بیٹا باپ کے تعلق سے نام لکھتا ہے۔"

"تو پھر اسی تعلق سے لکھو۔ تمہیں میرے دوست احمد یار خان کے نام کو زندہ رکھنا

ہے۔"

"نام اس باپ کا ہو گا جس نے کام دکھایا ہے۔ اگر ابو زندہ ہوتے' مجھے تعلیم دلاتے اور آج کی طرح قابل بناتے تو میری تمام قابلیت ان کے نام ہوتی۔ افسوس! قاتلوں نے انہیں میرے کام آنے کا موقع نہیں دیا۔"

اس نے سر جھکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اپنے والد کا تصور کرنا چاہا' مگر وہ کون تھے؟ کیسے تھے؟ ان کی تصویر بھی نہیں رہی تھی۔ فسادات کی آگ میں سب کچھ جل چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "پتا جی! اپنے والدین کی یادگار کے طور پر میرا وجود کافی ہے۔ میرا نام اب بھی امجد ہے میں مسلمان ہوں لیکن جو کارنامہ آپ نے انجام دیا ہے اس کا کریڈٹ آپ کو ملنا چاہئے۔ میرے برتھ سرٹیفکیٹ میں اسکول اور کالج کے رجسٹر میں میرا نام امجد یار خان ہے لیکن علم وادب کی دنیا میں اور جرنلزم میں میں امجد کمار سکسینہ کہلاؤں گا۔"

بات معقول تھی۔ اس کے پتا جی نے بحث نہیں کی۔ ایم اے فائنل تک پہنچتے پہنچتے مختلف اخبارات میں اس کے اتنے مضامین' مقالے اور سیاسی تبصرے شائع ہو چکے تھے کہ سیاسی پارٹیاں اس سے رجوع کرنے لگی تھیں۔ الیکشن سے پہلے بڑے بڑے لیڈر اس سے مشورے طلب کرتے تھے اور اس کے مطابق اپنی لائن آف ایکشن بناتے تھے۔ ان میں سے کتنے ہی کامیاب ہو گئے تھے اور اس کا نام جپتے ہوئے اسمبلیوں میں پہنچ گئے تھے۔ اس طرح امجد کمار سکسینہ کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔

اسمبلیوں میں پہنچنے والے اپوزیشن کی بینچوں پر ہوتے تھے اگر حکمران پارٹی سے تعلق رکھتے تو ان میں سے کتنے ہی وزیر بن جاتے اور امجد کو بھی مالا مال کردیتے۔ اس کے باوجود آمدنی کے کافی ذرائع تھے۔ پتا جی نے اخبار کی ملازمت چھوڑ دی۔ بیٹا خوب کمارہا تھا۔ بڑھاپے میں کام کرنے نہیں دیتا تھا۔ باپ کے ہاتھ سے قلم چھین کر رکھ دیتا تھا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے بیٹے سے ہار مان لی تھی۔

بھوپال میں ان کا آبائی مکان تھا۔ کچھ زمینیں تھیں جہاں سے اناج آتا تھا۔ وہ اپنی پتنی اور بیٹے کے ساتھ بھوپال آگئے تھے۔ امجد کبھی ان کے پاس رہتا تھا کبھی صحافت کے سلسلے میں دہلی آجاتا تھا۔ ایک روز دہلی میں ایک خاتون اس سے ملنے آئیں۔ انہوں نے

کہا۔ میں پاکستان سے آئی ہوں۔ اپنے ایک عزیز کے ہاں قیام کیا ہے میرے عزیز تمہارے کالم پڑھا کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا تم موہن کمار سکسینہ کے بیٹے ہو اور وہ موہن صاحب کبھی میرے بھائی کے بہت گہرے دوست ہوا کرتے تھے۔

امجد نے پوچھا۔ "آپ کے بھائی صاحب کا نام کیا ہے؟"

"اب نام کہاں ہے' فسادات میں مارے گئے تھے' ان کا نام احمد یار خان تھا۔"

امجد نے خاتون کو چونک کر دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "فسادات سے پہلے میں علی گڑھ میں تھی۔ مجھے خط ملا کہ بھابی نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ میرے بھائی باپ بن گئے ہیں۔ اس کے ڈیڑھ ماہ بعد میں اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان جارہی تھی۔ دہلی اسٹیشن پر میرے اسی عزیز نے یہ المناک خبر سنائی کہ بھائی اور بھابی فسادات میں شہید ہو گئے ہیں۔ موہن کمار سکسینہ سے ایک برس بعد میرے عزیز کی ملاقات ہوئی پتا چلا میرے بھائی کا بیٹا ان کے پاس ہے۔ انہوں نے کہا تھا میرے دوست کی کوئی سگی بہن یا سگا بھائی' بچے کو گود لے گا تو میں دوں گا ورنہ خود اس کی پرورش کروں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ ذرا خاموش ہوئیں پھر بولیں۔ "ہمارا ایک بھائی بہت پہلے ہی پاکستان جاچکا تھا۔ میں بعد میں گئی۔ کوئی پچیس برس کے بعد دہلی آئی ہوں۔ پرسوں اپنے عزیز سے معلوم ہوا کہ میرے بھائی کا بچہ زندہ رہ گیا تھا اور اسے موہن صاحب لے گئے تھے تم تو ان کے بیٹے ہو تمہیں اس بچے کے متعلق کچھ معلوم ہو گا۔"

وہ کہہ رہی تھیں۔ امجد ان کی صورت دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار پتا چلا خون کی کشش کیسی ہوتی ہے۔ دل ان کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ احمد یار خان مرحوم کی سگی بہن ہیں؟"

"ہاں بیٹے! میں ان کی سگی بہن ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے آیا۔ پھر فرش پر گھٹنے ٹیک کر بولا۔ "پھوپی اماں! میں ہی وہ بچہ ہوں۔"

پھوپی نے بے اختیار اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیا پھر کہا۔ "میں اتنی دیر سے بول رہی تھی مگر تمہیں دیکھ دیکھ کر دل دھڑک رہا تھا وہی آنکھیں' وہی پیشانی' ویسا

ہی ناک نقشہ ہے تم بھائی جان کی تصویر ہو۔"

وہ اس کی پیشانی کو چوم رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔ پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"میں نے جس عزیز کا ذکر کیا ہے' وہ دور کے رشتے سے تمہارے ماموں لگتے ہیں۔ اگر انہوں نے نہ بتایا ہوتا تو میں مرحوم بھائی کی یہ تصویر دیکھے بغیر چلی جاتی اور یہ تم نے کیسا نام رکھا ہے' آدھا مسلمان اور آدھا ہندو؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "میرا نام امجد یار خان ہے۔ پتا جی کی محبت' محنت اور توجہ سے آج میں ایک کامیاب جرنلسٹ ہوں۔ لہٰذا ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے میرا نام امجد کمار سکسینہ ہے۔"

"بیٹے! ہم موہن صاحب کا جتنا بھی احسان مانیں' وہ کم ہے۔ ان کی محنت اور محبت کا صلہ ہم نہیں دے سکتے' خدا ہی دے سکتا ہے لیکن ایک مسلمان کو غیر مسلم نام اختیار نہیں کرنا چاہئے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کبیر ہندو کا نام بھی ہوتا اور مسلمان کا بھی۔ بھگت کبیر داس مسلمان تھے یا ہندو' یہ آج تک فیصلہ نہ ہوسکا۔ فلمی دنیا کی عظیم شخصیت دلیپ کمار مسلمان ہیں۔ ہندو نام کے باوجود ان کے ایک اچھے مسلمان ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ آپ پاکستانی ہیں' ہم ہندوستانی ہیں۔ اگرچہ ہم مسلمان ہیں مگر آپ کے اور ہمارے سوچنے کا انداز بہت سے معاملات میں مختلف ہے۔ آپ نام کے جھگڑے میں نہ پڑیں۔"

"توبہ ہے۔ میں بھی کیا بات لے بیٹھی۔ تم جیسے بھی خوش رہو اسی میں ہماری خوشی ہے۔ چلو میرے ساتھ۔ یہاں تمہارے دور کے عزیز رشتے دار ہیں۔ دور کے ہی سہی' اپنے تو ہیں' میں ان سے تمہیں ملاؤں گی۔"

"چلئے۔ مگر آپ بھی میرے ساتھ بھوپال جائیں گی اور میری ماں جی اور پتا جی سے ملاقات کریں گی۔ پھوپی اماں' آپ سے مل کر ایسا لگ رہا ہے' دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہے۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس دنیا میں میرے ابو کے خون سے قریب کوئی رشتہ ہوگا۔"

"بیٹے! میں اپنی خوشی بیان نہیں کرسکتی۔ مجھے کم از کم شکریہ ادا کرنے کے لئے

موہن بھائی کے پاس جانا چاہئے مگر ویزا میں وقت ختم ہوگیا ہے۔ مجھے پرسوں واپس جانا ہوگا۔"

"آپ نہیں جائیں گی۔ پاسپورٹ اور ویزا مجھے دیجئے۔ آپ کا بھتیجا بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ میں ویزا بڑھوالوں گا۔"

اس نے پھوپی اماں کے ساتھ جاکر اپنے رشتے داروں سے ملاقات کی۔ وہاں کئی گھر تھے ہر گھر میں بزرگ' بچے' جوان' لڑکیاں اور لڑکے اس سے بڑی محبت سے مل رہے تھے۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے یا کم از کم اخبار پڑھنے والے رشتے دار اس کی تحریری صلاحیتوں پر قربان ہو رہے تھے۔

اسے اتنی محبتیں ملیں کہ وہ روز جانے لگا۔ یوں بھی پھوپی اماں اسے چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ اس سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ جرنلسٹوں کی کینٹین میں نہیں کھائے گا۔ دونوں وقت پھوپی اماں کے ساتھ کھایا کرے گا۔ وہ ہنستے ہنستے کہتی تھیں' پاکستان میں میرے دو ہی بیٹے ہیں۔ اگر بیٹی ہوتی تو فوراً تمہیں داماد بنالیتی۔ ویسے اس بار تمہاری بات کہیں پکی کرکے جاؤں گی۔ دوسری بار آکر شادی کردوں گی۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی ماں جی اور پتا جی کے لئے ہندو گھرانے سے بہو لے آؤ۔

پھوپی کے ویزا کی تاریخ بڑھ گئی۔ دو دن بعد بھوپال جانے کا پروگرام بن گیا۔ اسی دن وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ماموں کے گھر سے نکلا تو سامنے والے گھر کے دروازے پر ایک سانولی سلونی سی لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ سیاست کے خشک موضوع سے کھیلنے والا قلم کار تھا۔ اخبارات کے دفتروں میں اور سیاسی لیڈروں کے محلوں میں حسین اور ذہین لڑکیوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن کسی میں ایسی کشش محسوس نہیں ہوئی جیسی وہ سانولی سی لڑکی محسوس کرا رہی تھی۔ چہرے کے نقوش اتنے پیارے تھے کہ وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

لڑکی اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاکر نظریں چرانے لگی۔ پھر بولی۔ "آپ وہی امجد صاحب ہیں نا؟ میری سہیلی کہہ رہی تھی کہ......"

اس نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی تھی؟ کیا میرے ماموں کی صاحبزادی تمہاری سہیلی

ہے؟"

"جی ہاں۔ میں اسی شبانہ کی بات کر رہی ہوں۔"

"شبانہ تم سے کیا کہہ رہی تھی؟"

"جانے دیجئے۔ کیا کریں گے سن کر؟"

"دیکھو۔ مجھ میں کوئی تو خاص بات ہوگی جسے سن کر اس اجنبی سے تم باتیں کر رہی ہو۔"

"میں کہوں گی تو آپ کو برا لگے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں' جواب میں تمہیں برا نہیں کہوں گا۔ خاموشی سے چلا جاؤں گا۔"

"وہ کہہ رہی تھی' آپ آدھے ہندو آدھے مسلمان ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ ایسا انسان ہونا جو ہندو کا بھی اپنا ہو اور مسلمان کا بھی' میرے لئے اعزاز ہے۔"

وہ ہاتھ نچا کر بڑی پیاری ادا سے بولی۔ "اپنا فلسفہ رہنے دو۔ تم مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

"تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

"مجھ سے لگاوٹ والی بات نہ کرنا۔ میں باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ میرا نام سلمٰی ہے۔"

"اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ میں پوچھنے والا تھا۔"

"کیا فری ہونے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"ارے' تم فری ہونے کی بات کر رہی ہو۔ میں نے تو پہلی نظر میں شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

سلمٰی کے منہ سے حیرت کی ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس نے غصے سے دیکھا پھر ایک دھڑاکے سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ مسکراتا ہوا اور سوچتا ہوا گھر کے اندر آیا۔ پھوپی نے پوچھا۔ "امجد تم گئے نہیں؟ تم تو کہہ رہے تھے' ضروری کام سے جانا ہے۔"

"جی ہاں۔ مگر اس سے بھی ایک ضروری کام آپ سے ہے۔"

"کیا کام ہے؟"

آنگن میں ماموں' ممانی اور پڑوس کے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ "ذرا کمرے میں چلئے۔"

وہ کمرے میں اس کے ساتھ آئیں' ایک پلنگ کے سرے پر بیٹھ گئیں۔ وہ فرش پر بیٹھ کر ان کا ایک پاؤں دابنے لگا۔ وہ تعجب سے بولیں۔ "کیا تم ضروری کام چھوڑ کر میری خدمت کرنے آئے ہو؟"

"جی نہیں۔ جی ہاں۔ وہ ایک بار آپ نے کہا تھا کہ بیٹی ہوتی تو آپ مجھے داماد بنالیتیں۔"

"ہاں کہا تھا مگر نہیں ہے' اب کیا کروں؟"

"کرنا کیا ہے۔ وہ سامنے والے مکان میں ایک لڑکی سلمٰی رہتی ہے' آپ اسے بیٹی بنالیں۔"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "اچھا! تو اس لئے پاؤں دبائے جا رہے ہیں۔" پھر سوچتے ہوئے بولیں۔ "لڑکی سانولی ہے مگر بہت پیاری ہے۔ دس جماعتیں پاس ہے۔ میں تین مہینے سے یہاں ہوں۔ اس میں بڑا سلیقہ اور سوجھ بوجھ دیکھی ہے۔ لڑکے! تو نے ایسی لڑکی پسند کی ہے جیسی میں چاہتی تھی۔ اگر شادی ہوگئی تو وہ تجھے پکا مسلمان بنا کر چھوڑے گی۔"

"تو پھر آپ اس کے گھر جا رہی ہیں؟"

"پتا نہیں' اس کے ماں باپ راضی ہوں گے یا نہیں؟ مگر میں بات کروں گی۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تو پھر چلئے۔"

"اے لڑکے دیوانہ ہو گیا ہے! کچھ معلومات حاصل کئے بغیر کیسے چلی جاؤں۔ معلوم تو ہو' کہیں اس کا پہلے سے رشتہ ہو چکا ہو۔ اگر وہ ہمیں رشتہ دینے پر راضی ہوں گے تو انہیں سچ بتانا ہوگا کہ لڑکی بیاہ کر ہندو گھرانے میں جائے گی۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ ایک عام سی بات ہے۔ اگر ایک ہندو مسلمان گھرانے میں ہو تو کوئی ہندو اپنی لڑکی اس گھر میں نہیں دے گا خواہ لڑکا کتنا ہی کٹر ہندو ہو۔ لڑکی والے صرف

لڑکے کے نہیں' اس کے گھر اور ماحول کو بھی دیکھتے ہیں۔

وہ رات کو کھانے کے لئے آیا تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے رک گیا۔ سامنے والا دروازہ کھل گیا تھا وہ پھر نظر آئی۔ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "بڑے ضدی بنتے ہو' جو کہتے ہو' کر دکھاتے ہو۔ رشتہ مانگنے کے لئے اپنی پھوپی کو بھیج دیا!"

اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ "تمہارے والدین نے منظور کیا؟"

وہ بڑی ادا سے ہاتھ نچا کر بولی۔ "اے' آدھے ہندو۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے؟"

"یقین کرو۔ میں پورا مسلمان ہوں۔ ہاں' مگر ہندو دھرم سے بھی محبت کرتا ہوں۔"

"اگر پورے مسلمان ہو تو بتاؤ' میں ابھی کون سی نماز پڑھ کر آ رہی ہوں؟"

وہ ذرا چکرایا۔ پھر دل ہی دل میں جلدی جلدی یاد کرنے لگا۔ صبح کی نماز کو فجر' دوپہر کی نماز کو ظہر' شام کی نماز کو.......... یاد نہیں آ رہا ہے۔ کچھ اچھا ہی کہتے ہیں۔ ابھی شام نہیں رات ہے۔ رات کی نماز کو کیا کہتے ہیں؟ ہے بھگوان! اسے عربی میں کیا کہتے ہیں۔ میں کیسے بھول گیا۔ پہلے مجھے یاد تھا۔

سلمٰی نے کہا۔ "شرم نہیں آتی خود کو مسلمان کہتے ہو اور نماز.........."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ اچھل کر بولا۔ "عشاء! رات کی نماز کو عشاء کہتے ہیں۔ صبح کی نماز کو فجر کی نماز کہتے ہیں۔ تم مجھے سمجھتی کیا ہو؟ مجھے سب معلوم ہے۔"

"وہ تو تمہاری صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں سب معلوم ہے۔ اچھا بتاؤ' عشاء کی نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں؟"

وہ پھر الجھ گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ.......... یہ کیا تم نے پوچھنا شروع کر دیا ہے۔ کیا تم میرا انٹرویو کر رہی ہو؟"

"یہی سمجھو۔ میں بہت دیر سے چھت پر تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم ضدی ہو تو میں بھی کم نہیں ہوں۔ میں نے سوچ لیا تھا' پہلے تمہاری اصلیت معلوم کروں گی۔ تمہیں گلی میں آتے دیکھا تو چھت سے اتر کر آئی ہوں۔ ہاں' چلو جواب دو۔"

وہ پیٹ پکڑ کر بولا۔ "میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ میرے پیٹ میں بہت تکلیف ہو

رہی تھی۔ اب بھی ہو رہی ہے۔ اگر تم ذرا مہلت دو تو میں تھوڑی دیر بعد آ کر تمام سوالوں کے جواب دوں گا۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "میں بار بار گلی کے دروازے پر نہیں آ سکتی۔ کیا مجھے بدنام کرنا چاہتے ہو؟"

"ارے نہیں' غلط نہ سمجھو۔ میں ایک ملاقات کر کے تمہیں اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلانا چاہتا ہوں۔"

"سوری میں نہیں آ سکتی۔"

"پلیز! مایوس نہ کرو۔"

وہ تھوڑی دیر سوچ کر بولی۔ "میں صبح دس بجے ٹائپنگ سیکھنے جاتی ہوں۔"

"کہاں جاتی ہو؟ جلدی بتاؤ۔"

"جامع مسجد کے پاس سڑک کے کنارے جہاں مچھلیاں تل کر فروخت کی جاتی ہیں' ٹھیک اس کے پیچھے ٹریننگ سینٹر ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ خوش ہو کر گھر میں آیا۔ مسکراتے ہوئے بزرگوں کو سلام کیا۔ ماموں نے جواب دے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے' داہنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سلام کرتے ہیں اور تم ہو کہ نمستے کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہو اور منہ سے السلام علیکم کہتے ہو۔"

"ماما جی! پرانی عادت ہے۔ جاتے جاتے ہی جائے گی۔ بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ پھوپی اماں کھانا نکالئے' میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔"

آنگن میں موری کے پاس پانی اور صابن رکھا ہوا تھا۔ اس نے وہاں بیٹھ کر ماموں کے چھوٹے بیٹے کو آواز دی۔ وہ پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے منہ دھوتے ہوئے پوچھا۔ "راشد! نماز پڑھتے ہو یا نہیں؟"

"کبھی کبھی پڑھتا ہوں بھائی جان۔"

"شاباش! اچھا بتاؤ عشا کی نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں؟"

راشد سوچنے لگا۔ ماموں نے ڈانٹ کر کہا۔ "گدھے اسی لئے سمجھاتا ہوں' نماز پڑھا

کرو۔ سال چھ مہینے میں ایمان جوش مارتا ہے یا خدا کا خوف غالب آتا ہے تو مسجد چلے جاتے ہو۔ تمہارے امجد بھائی جان کتنا اچھا سوال کر رہے ہیں' جلدی جواب دو۔"

راشد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان میں نماز پڑھتے پڑھتے گنتا بھول جاتا ہوں۔ پھر اپنے اللہ میاں کے سامنے رکعتوں کا کیا حساب کرنا۔ جتنی عبادت کریں' جتنے سجدے کریں' کوئی روکنے والا تو نہیں ہے۔"

امجد نے منہ دھوتے ہوئے سوچا۔ میں بھی کتنا احمق ہوں' اتنا آسان اور معقول جواب میرے ذہن میں نہیں آیا اور میں سلمیٰ کے سامنے فیل ہو گیا۔

کھانے کے دوران پھوپی نے کہا۔ "میں نے جو خیال ظاہر کیا تھا وہ درست نکلا۔ وہ لڑکی دینے کو راضی ہیں لیکن یہ بات پسند نہیں ہے کہ وہ ہندو گھرانے میں جائے۔"

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ "اس گھر میں تہذیب ہے' طور طریقے ہیں' صفائی ستھرائی ہے اور محبتیں ہی محبتیں ہیں پھر اعتراض کیا ہے؟"

"بیٹے! ہماری ان کی تہذیب میں فرق ہے۔"

"صرف عبادت کے طور طریقوں میں فرق ہے۔ مذہب الگ الگ ہیں' اس کے باوجود میں وہاں رہ کر بچپن سے اب تک مسلمان ہوں۔ ان کی بیٹی بھی آخری دم تک مسلمان رہے گی۔ آخر انہیں اندیشہ کیا ہے۔"

"میں نے انہیں حتی الامکان سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ لڑکا اکثر دہلی میں رہتا ہے۔ ان کی بیٹی اپنے میاں کے ساتھ رہا کرے گی۔"

"نہیں پھوپی اماں! میں صرف اپنے لئے نہیں۔ ماں جی اور پتا جی کے سکھ کے لئے بھی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھوپال میں ان کے پاس رہے گی۔"

"میں نے تو لڑکی والوں کو سمجھانے کے لئے کہہ دیا ہے' شادی کے بعد تم میاں بیوی جو فیصلہ کرو گے وہی ہو گا۔ پہلے وہ لڑکی دینے کو راضی تو ہو جائیں۔"

وہ ذرا قریب ہو کر آہستگی سے بولیں۔ "ہمیں ان کے دروازے پر زیادہ ناک نہیں رگڑنا ہے۔ تمہاری شہرت دور دور تک ہے۔ اچھا کماتے کھاتے ہو۔ اسی محلے میں ایک سے ایک حسین لڑکی ہے۔ میرے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہے' ان کے ماں باپ رشتہ دینے

کو ایک پاؤں پر کھڑے ہیں۔"

"پھوپی اماں! زندگی میں پہلی بار یہی ایک لڑکی پسند آئی ہے۔ یہاں بات نہ بنی تو میں شادی کا خیال ہی چھوڑ دوں گا۔"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "سلمیٰ تجھے اتنی پسند ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔ انہوں نے کہا۔ "تم میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہو۔ برسوں بعد اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ملے ہو۔ میں سلمیٰ کے لئے پوری کوشش کروں گی۔"

"پھوپی اماں! کیا وہ پانچوں وقت نماز پڑھتی ہے؟"

"ہاں' یہی بات تو مجھے پسند ہے۔ فجر کی نماز پڑھ کر تلاوت بھی کرتی ہے۔"

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ بڑی مشکل ہے۔ وہ نماز روزے کے بارے میں جانے کیسے کیسے سوال کرے گی۔ یہ دل بھی کہاں جا کر اٹکا ہے۔ کسی ماڈرن لڑکی پر دل آتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ نہ جانے اس میں کیسی کشش ہے جب سے دیکھا ہے تب سے سوتے جاگتے خیالوں میں چلی آتی ہے۔ لکھنے پڑھنے بیٹھتا ہوں تو آنکھوں میں اس کی صورت پھرنے لگتی ہے۔ یہ محبت بھی کیا چیز ہے' مجھ جیسے خشک سیاسی آدمی کے اندر پھول کھلا رہی ہے۔

کھانے کے بعد ہوسٹل جاتے وقت اس نے راشد سے تعلیم الاسلام کی کتاب لے لی۔ اس نے سوچ لیا تھا' رات بھر میں اسلامی تعلیمات سے متعلق تمام اہم باتیں یاد کر لے گا۔ صبح امتحان دینا تھا۔ وہ ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھ کر پہلے صفحے سے کتاب پڑھنے لگا۔ جتنی نمازیں ہیں' ان کی رکعتوں کی تعداد یاد کرنے لگا۔ کتاب میں لکھا تھا' ہر رکعت کی ابتدا سورہ فاتحہ سے ہوتی ہے۔ گویا اسے یاد کرنا ضروری تھا لیکن وہ عربی زبان تھی۔ بچپن میں پتا جی اسے کلام پاک پڑھانے کے لئے مسجد بھیجا کرتے تھے مگر وہ دل لگا کر نہیں پڑھتا تھا۔ مسجد سے بھاگ جاتا تھا۔ اب اس کا نتیجہ سامنے آرہا تھا۔

اس نے ہوسٹل میں رہنے والے ایک مسلمان لڑکے سے پوچھا۔ "تم عربی پڑھ سکتے ہو؟"

"ہاں' پڑھ سکتا ہوں۔"

"کیا تم مجھے سورہ فاتحہ پڑھا سکتے ہو؟"

"ضرور پڑھا سکتا ہوں۔ چلو' میرے ساتھ پڑھتے جاؤ۔"

وہ ساتھ ساتھ پڑھنے لگا۔ لکھنے پڑھنے اور کسی بات کو یاد رکھنے کے سلسلے میں وہ بچپن ہی سے ذہین تھا۔

وہ صبح پانچ بجے تک پڑھاتا رہا۔ امجد پڑھتا رہا اور کمال ذہانت سے ایک ایک لفظ ذہن نشین کرتا رہا۔ پھر ساتھی نے کہا۔ "تمہارے سیکھنے کے لئے ابھی بہت کچھ ہے پھر بھی جتنا سیکھ چکے ہو وہ بھی کم نہیں ہے۔"

سلمیٰ نے دس بجے آنے کے لئے کہا تھا۔ وہ نو بجے وہاں پہنچ گیا۔ اس کے انتظار میں پڑھا ہوا سبق بار بار دہراتا رہا۔ وہ دس بجے سے کچھ پہلے آگئی۔ سامنے ہوتے ہی اس نے سر پر آنچل رکھتے ہوئے سلام کیا۔ امجد نے عادت کے مطابق بے اختیار دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "وعلیکم السلام۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ امجد کو غلطی کا احساس ہوا۔ "سوری۔ ایسا انجانے میں ہوتا ہے مگر سوچو تو یہ اچھی بات ہے۔ میں نے ایک ہی وقت میں نمستے بھی کیا ہے اور سلام بھی۔"

وہ ہنسی پر قابو پاکر ذرا سنجیدگی سے بولی۔ "میں بحث نہیں کروں گی لیکن ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا چاہئے۔"

وہ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ امجد نے پوچھا۔ "کیا ہم کسی پارک میں چل سکتے ہیں؟"

سلمیٰ نے آنکھیں دکھائیں۔ وہ جلدی سے بولا۔ "وہاں تم سکون سے میرا امتحان لے سکو گی۔"

"وہاں فلرٹ کرنے والی لڑکیاں جاتی ہیں۔ میں بدنام نہیں ہونا چاہتی۔"

"قطب مینار چلو گی؟ میں اس کی بلندی پر پہنچ کر زور زور سے آیتیں پڑھوں گا۔ میری آواز اس شہر میں دور دور تک جائے گی۔ پھر میں زور سے چیخ کر کہوں گا' مجھے سلمیٰ کی ضرورت ہے۔ پھر میں نیچے اتر کر بہت دور وہاں تک دوڑتا جاؤں گا جہاں تک آواز

جا رہی ہوگی۔ میں اس آواز کو مٹھی میں بند کرکے لاؤں گا اور تمہیں دکھاؤں گا۔ تم جیسے ہی میری مٹھی کھولو گی' اس میں چھپی ہوئی آواز یکلخت ابھرے گی۔ مجھے سلمیٰ کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے۔ ضرورت ہے۔ ضرورت ہے۔"

وہ سر جھکا کر سن رہی تھی اور دوپٹے کے آنچل سے کھیل رہی تھی۔ پھر گھوم کر سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ امجد نے کہا۔ "ذرا ٹھہرو' ہم رکشے میں جائیں گے۔"

"میں قطب مینار نہیں جاؤں گی۔ کیا تمہارے ہوسٹل میں لڑکیوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے۔ وہاں تو اخباروں.......... اور سیاست سے تعلق رکھنے والی سینکڑوں عورتیں آتی رہتی ہیں۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میرے کمرے میں آرام سے بیٹھ سکو گی۔"

وہ ہوسٹل میں آگئے۔ میز پر' بستر پر اور فرش پر کاغذات اور لکھنے پڑھنے کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ سلمیٰ نے کہا۔ "توبہ! تم اتنے گندے رہتے ہو!"

"نن نہیں۔ میں تو صفائی پسند ہوں۔ کل رات سے جاگ رہا ہوں۔ مجھے صفائی کا موقع نہیں ملا۔ تم ایک طرف بیٹھو' میں ابھی کمرا سیٹ کردیتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ تم ایک طرف بیٹھو میں ٹھیک کرتی ہوں۔"

وہ کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ اس نے روکنا چاہا۔ وہ بولی۔ "یہ بھی ایک سبق ہے۔ دیکھو اور سیکھو۔ زندگی کیسے سلیقے سے گزاری جاتی ہے۔"

"گھر میں عورت کے آنے سے سلیقہ آتا ہے۔" امجد بولا۔

وہ انجان بن کر کام میں مصروف رہی۔ اگر وہ موجود نہ ہوتی تو وہ گہری نیند میں ہوتا۔ اس سے نیند برداشت نہیں ہوتی تھی۔ کام زیادہ ہوتو وہ جاگتا تھا مگر رات کے کسی حصے میں تھوڑی نیند پوری کرلیتا تھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے نیند برداشت نہیں ہوتی' زندگی میں پہلی بار کل سے جاگ رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "ایسی بھی کیا بات ہے۔ اتنے بڑے ہوگئے ہو۔ ایک رات جاگنے کی عادت ڈالنا چاہئے۔"

"یہی تو نہیں ہوتا...... بچپن میں کوئی سبق یاد نہ ہوتا تو پتا جی دیوار سے لگا کر کھڑا کردیتے تھے اور حکم دیتے تھے' جب تک سبق یاد نہیں ہوگا' مجھے سونے نہیں دیا جائے گا۔ مگر میں دیوار سے لگا کھڑے کھڑے سوجاتا تھا۔ گرنے لگتا تو ماں جی آکر کلیجے سے لگالیتی تھیں اور مجھے بستر پر سلا دیتی تھیں۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔ لو' بستر صاف ہوگیا ہے' سو جاؤ۔ میں صفائی پوری کرکے چلی جاؤں گی۔"

"اوئے' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں بھلا ایسے سو سکتا ہوں۔ تم سے خوب باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بول رہا تھا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ایک لڑکی کے دل میں پیار بھر دینے کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ رات بھر اس کے لئے جاگتا رہا تھا اور ایمان کی باتیں سیکھتا رہا تھا۔ سلمٰی کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی' امجد زیادہ سے زیادہ اپنی محبت کا یقین دلائے۔ اس نے کہا۔ "لو صفائی ہوگئی۔ اب میں سبق سنوں گی لیکن تمہیں تو نیند آرہی ہے۔"

"نہیں' بالکل نہیں' میں جاگ رہا ہوں اور جاگتا رہوں گا۔"

"کیا تم دو گھنٹے تک مزید جاگ سکتے ہو؟"

"تم دن بھر رہو' میں دن بھر جاگتا رہوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس کے باوجود جاگتے رہنے کا دعویٰ کررہا تھا۔ سلمٰی نے کہا۔ "یہاں قریب ہی میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ اس سے ملاقات کرنا ضروری ہے۔ ابھی نہیں جاؤں گی تو وہ بارہ بجے تک ڈیوٹی پر چلی جائے گی۔"

"چلو' میں وہاں لے چلتا ہوں۔"

"کیا اپنے ساتھ لے جاکر بدنام کرنا چاہتے ہو؟ میں اکیلی جاؤں گی۔ جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گی مگر نہیں تم تو سوجاؤ گے۔"

"کون کافر سوئے گا۔ میں جاگتا رہوں گا۔"

"تو پھر جاؤں؟"

وہ اسے ہوسٹل کے باہر چھوڑنے آیا۔ پھر کمرے میں واپس آکر اپنے بستر کے سرہانے...... بیٹھ گیا۔ یوں تو بستر ہمیشہ ہی آرام دہ ہوتا ہے مگر آج سلمٰی اپنے ہاتھوں سے بچھا کر گئی تھی' اس لئے اس پر لیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ذرا سی لیٹنے کی خواہش اسے سلا سکتی تھی۔ ایسے میں سلمٰی آتی تو اسے سوتا دیکھ کر چلی جاتی۔ وہ کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

آدمی تمام رات جاگنے کے بعد دوسرے دن بھی مصروف رہے تو قوتِ ارادی سے جاگ کر کام پورا کرلیتا ہے۔ کام نہ رہے تو نیند اس پر غالب آجاتی ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر سلمٰی کو تصور میں دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ بول رہی تھی۔ بہت ہی مترنم آواز میں دھیما دھیما سا لہجہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا' وہ گنگنا رہی ہے۔ لوری سنا رہی ہے۔

وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ کیونکہ آنکھ لگ رہی تھی جس کا انتظار کررہا تھا' وہی آنکھ لگا رہی تھی۔ وہ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ یوں آدھا گھنٹا گزر گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ کر شروع سے ایک ایک سبق دہرانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پتا چلا وہ پڑھتے پڑھتے سو رہا ہے۔ اب پریشانی بڑھ رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سوجائے اور اتنی پیاری سی محبت آکر چلی جائے۔ یہ تو خوش نصیبی کو دروازے سے لوٹانے والی بات ہوتی۔ اس نے اٹھ کر دروازے سے باہر آکر دیکھا پھر کمرے میں آکر کھڑکی کے باہر دور تک نظر دوڑائی۔ وہاں سے ایک سڑک نظر آتی تھی۔ مگر سلمٰی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے پلٹ کر میز پر ایک گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "ایسی بھی کیا نیند ہے؟ بھلا کوئی اپنی محبت کے انتظار میں سوتا ہے؟ میں کمزور نہیں ہوں۔ میں ارادے کا پکا ہوں۔ جاگوں گا' جاگتا رہوں گا۔ اپنی سلمٰی کے آنے تک جاگتا رہوں گا۔"

اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے میز کی دراز کھول کر بڑی سی موم بتی اور ماچس نکالی۔ رات کو لکھتے پڑھتے وقت بجلی چلی جاتی تو وہ موم بتی جلا کر اپنا مضمون مکمل کیا کرتا تھا۔ اس نے موم بتی کو جلا کر میز پر رکھا۔ کرسی کھینچ کر قریب بیٹھا۔ پھر آرام سے بیٹھ کر بسم اللہ پڑھتے ہوئے اپنی ہتھیلی جلتی ہوئی لو پر رکھ دی اور سورہ فاتحہ کو بلند آواز میں پڑھنے لگا۔

ایسے میں تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ جب تکلیف ناقابل برداشت ہوتی تو وہ لو سے اپنا ہاتھ ذرا اوپر اٹھالیتا تھا۔ یوں دیر تک جلن محسوس ہوتی رہتی۔ اس احساس کو مٹانے کے لئے وہ زور زور سے پڑھنے لگتا تھا۔ جب جلن کا احساس مٹنے لگتا تو اندیشہ ہوتا کہ نیند غالب نہ آئے وہ پھر لو پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ جنون میں مبتلا ہوگیا ہے یا بے خودی میں زور زور سے پڑھنے لگا ہے۔ اس کی آواز کمرے سے باہر دور تک جارہی تھی۔ کتنے ہی اخباری رپورٹر' کالم نگار اپنے کمروں سے نکل کر اس کے دروازے پر آگئے تھے اور اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ ایک عورت نے کہا۔ "اسے روکو۔ یہ اپنا ہاتھ جلالے گا۔"

ایک آدمی نے کہا۔ "کسی کے مذہبی معاملے میں مداخلت نہیں کرنا چاہئے۔ یہ عربی میں کچھ پڑھ رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "میں نے محرم میں کچھ مسلمانوں کو آگ پر چلتے دیکھا ہے۔"

تیسرے نے کہا۔ "یقیناً یہ ان کا عبادت کا طریقہ ہوسکتا ہے ہمیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہئے۔"

سلمیٰ نے حیرانی سے بھیڑ کو دیکھا۔ اس کے کانوں میں آیتیں پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ جلدی سے بھیڑ کو چیرتی ہوئی اندر آئی پھر امجد کو دیکھتے ہی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ موم بتی کی لو پر اس کی ہتھیلی اوندھی تھی اور وہ جل کر سرخ اور سیاہی مائل ہوتی جارہی تھی۔ وہ بے اختیار چیختی ہوئی آگے بڑھی۔ "نہیں امجد نہیں............"

اس نے آگ پر سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس جلے ہوئے حصے کو اپنے رخساروں سے اپنی آنکھوں سے لگا کر رونے لگی۔ اس کی ہتھیلی سے جلے ہوئے گوشت کی بو آرہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے لوگوں سے کہا۔ "کہیں سے برنول لے آؤ۔ پلیز! جلدی کرو۔ فرسٹ ایڈ کا سامان ہی لے آؤ۔ پلیز' ہری اپ۔"

دو چار آدمی دوڑتے ہوئے چلے گئے۔ وہ دیوانہ وار اس کی جلی ہوئی ہتھیلی کو چوم رہی تھی۔

وہ ہوسٹل صرف اخبارات سے تعلق رکھنے والوں کے لئے تھا۔ وہاں فوٹوگرافر بھی رہتے تھے۔ دوسرے دن کے اخبارات میں دو طرح کی تصویریں شائع ہوئیں۔ ایک تصویر میں امجد جلتی ہوئی لو پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ دوسری تصویر میں سلمیٰ اس کی ہتھیلی کو چوم رہی تھی۔ امجد ہوسٹل کے ساتھیوں کو گھونسا دکھاتا پھر رہا تھا۔ "تم لوگوں نے یہ بات اخبارات تک کیوں پہنچائی' مجھ سے پوچھنا تو چاہئے تھا۔ میری سلمیٰ بدنام ہوجائے گی۔ وہ مجھ سے ناراض ہوجائے گی۔"

بات کو بگڑنا چاہئے تھا۔ لڑکی والوں کو ناراض ہونا چاہئے تھا مگر تصویر گواہ تھی کہ لڑکی خود ہتھیلی چوم رہی ہے۔ یوں بگڑنے والی بات بن گئی۔ اس کے والدین نے کہا۔ "جب چاہو نکاح پڑھوا کرلے جاؤ۔"

پھوپی اماں نے کہا۔ "اب میں چھ ماہ بعد آسکوں گی۔ اسی وقت شادی ہوگی۔"

وہ اپنی پھوپی کو بھوپال لے گیا۔ اس کی ماں جی اور پتا جی نے پھوپی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنی محبت اور مہربانی کی انتہا کردی۔ پتا جی نے شادی کے متعلق کہا مجھے معلوم تھا ہمارا بیٹا ہماری مرضی کی بہو لائے گا۔ وہ ہمیں بہت پسند ہے۔

امجد نے پوچھا۔ "آپ نے سلمیٰ کو دیکھا تک نہیں ہے' پھر کیسے پسند کرلیا؟"

موہن کمار سکسینہ بولے۔ "اخبار میں تصویر دیکھی ہے۔ اگرچہ اخباری تصویر صاف نہیں ہوتی مگر بہو کی خوبصورتی صاف سمجھ میں آگئی۔ میرے بیٹے کے زخموں کو چومنے والی سے زیادہ خوبصورت کوئی دوسری نہیں ہوسکتی۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ پھوپی نے کہا۔ "چھ ماہ تک تم پاکستان آؤ گے تو میں شادی میں آؤں گی۔ اس بہانے ہمارا پاکستان بھی دیکھ لینا۔"

اس نے آنے کا وعدہ کیا۔ ایک ہفتے بعد پھوپی واپس چلی گئیں۔ اس نے پانچویں ماہ ویزے کے لئے درخواست دی تو رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔ سرکاری طور پر سوالات کئے گئے' وہ پاکستان کیوں جارہا ہے؟ اس نے کہا۔ "میرے پاس بین الاقوامی پاسپورٹ ہے۔ میں خاص سیاسی مواقع پر دوسرے ممالک جایا کرتا ہوں۔ مجھ سے کبھی سوال نہیں کیا گیا کہ کسی دوسرے ملک کیوں جارہا ہوں.......... پھر پاکستان کے لئے کیوں پوچھا جارہا ہے؟"

جواب ملا۔ ”اخباری سطح پہ تمہاری سیاسی سرگرمیوں کا علم ہے۔ ان معلومات کے مطابق تمہیں دوسرے ممالک جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ پاکستان سے تمہارا کیا سیاسی رشتہ ہے؟“

”سیاست کا نہیں، خون کا رشتہ ہے۔ میں اپنے سگے رشتے داروں سے ملنے جارہا ہوں۔“

اسے اجازت نہیں دی گئی۔ سیدھی سی بات تھی۔ ایک مسلمان صحافی پر اعتماد نہیں تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ جس طرح پاکستان کے ہندو نواز سیاست دان، ہندوستان آکر پاکستان کے خلاف سازش میں بھارتی حمایت اور امداد حاصل کرنے کی حماقت کرتے ہیں اسی طرح امجد پاکستان جاکر بھارت کے خلاف سیاسی کھچڑی پکا سکتا ہے۔

لیکن امجد کمار سکسینہ جیسے مقبول اور معتبر جرنلسٹ کو روکنا آسان نہیں تھا۔ اس نے اخبارات کے ذریعے پاکستان جانے کا مطالبہ کیا۔ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے چیئرمین اور سیکرٹری اور کئی اخبارات کے مدیران و مالکان نے ضمانت دی اور اس کے قابلِ اعتماد اور بے داغ کردار کی گواہی دی تو اسے اجازت مل گئی۔

انٹیلی جنس والے پہلے ہی اس پر نظر رکھتے تھے کیونکہ کانگریس کی مخالف سیاسی پارٹیوں سے اس کے تعلقات رہا کرتے تھے اور وہ موجودہ کانگریسی حکمرانوں پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ اب اس کے خلاف اور سختی سے تحقیقات ہونے لگی۔ پاکستان میں بھارتی ایجنٹوں کو اس کی پھوپی اور پھوپا کے نام اور پتے پہنچادیئے گئے اور اس کی کڑی نگرانی کرنے کا حکم دیا گیا۔

امجد ان باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ پاکستان گیا پھر ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد پھوپی اماں اور دوسرے رشتے داروں کو دہلی لے آیا۔ وہاں ماں جی اور پتا جی پہلے سے شادی کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ جمعے کے ایک مبارک دن شادی ہوگئی۔ فی الحال سلمیٰ کا میکا اور سسرال آمنے سامنے تھا لیکن اسے دلہن بنا کر ماموں کے گھر لایا گیا۔ آنگن میں ماں جی اور پتا جی آشیرباد دینے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ امجد نے گھونگھٹ کے قریب منہ لے جاکر کہا۔ ”ماں جی اور پتا جی کے چرن چھو کر آشیرباد لو۔“

سلمیٰ نے اس کے ساتھ جھک کر دونوں کے پاؤں چھولیے۔ پتا جی خوش ہوکر ڈھیر ساری دعائیں دینے لگے۔ ماں جی نے بہو کو گلے سے لگالیا۔ لڑکیوں نے اسے ایک سجے ہوئے کمرے میں لاکر بٹھادیا۔ وہاں گھنٹے بھر تک طرح طرح کی رسمیں ہوتی رہیں۔ پھر اسے دلہن کے کمرے میں پہنچادیا گیا۔

شادی کے دوسرے دن وہ بھوپال کے لئے روانہ ہوئے۔ پھوپی نے اسٹیشن تک آکر دعائیں دیں۔ اس سے پاکستان آنے کے لئے کہا پھر وہ رخصت ہوگئیں۔ ٹرین میں امجد نے کہا۔ ”سلمیٰ! یہ تو تمہیں معلوم ہوچکا ہے کہ میرے ماں باپ ہندو ہیں۔ تم اسی ہندو گھر میں زندگی گزارنے جارہی ہو مجھے خوشی ہوگی، اگر تم انہیں بیٹی کا پیار دو اور بیٹی بن کر ان کی خدمت کرتی رہو۔“

”میں انشاء اللہ ماں جی کو اور پتا جی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“

وہ ہر اعتبار سے ایک مثالی شریکِ حیات ثابت ہوتی رہی۔ امجد خوش تھا، صرف اس کے نماز روزوں سے پریشان ہوجاتا تھا۔ جب تک اس کے ساتھ بھوپال میں رہتا تھا، وہ ایک وقت کی بھی نماز کا ناغہ نہیں کرنے دیتی تھی۔ اس کے پیچھے پڑ جاتی تھی۔ دہلی کے لئے روانہ ہوتے ہی وہ پابندیوں سے آزاد ہوجاتا تھا۔ اس کی کچھ مجبوریاں ہوتی تھیں۔ کبھی وہ بہت زیادہ مصروف ہوتا تھا کبھی دہلی سے کلکتہ یا مدراس یا بمبئی سفر کی حالت میں رہتا تھا۔ ابھی اس میں ایسی پختگی نہیں آئی تھی کہ وہ ہر حال میں نماز جاری رکھتا۔

دو برس تک اس نے سلمیٰ کے ساتھ نہایت خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری۔ پھر ستارے گردش میں آگئے۔ بھوپال فیکٹری میں ایک حادثہ پیش آیا۔ ارون ماتھر نامی ایک ورکر مارا گیا۔ اس واقعے پر امجد نے ایک مضمون لکھا۔ اس میں ایسے حقائق بیان کیے جن کی تلخی کانگریسی حکام برداشت نہ کرسکے۔ اس نے لکھا تھا۔

”جب سے یہ فیکٹری قائم ہوئی ہے، کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ پیش آتا رہتا ہے۔ کبھی گیس پائپ کے ٹوٹنے سے اور کبھی ٹنکی سے گیس خارج ہونے کے باعث دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں بہت بڑا جان لیوا حادثہ پیش نہ آئے۔ مزدور یونین نے اور دیش کے کئی اخبارات نے بارہا اس فیکٹری کے خلاف آواز اٹھائی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے، فیکٹری کے

خلاف کوئی آواز اٹھے تو ہمارے حکام بہرے کیوں بن جاتے ہیں؟ اس کا جواب ہمیں تلاش کرنا ہوگا۔

دنیا کے کسی پسماندہ یا ترقی پذیر ملک نے اپنی زمین پر ایسی فیکٹری لگانے کی اجازت نہیں دی۔ بھارت نے کیوں دی؟ اس کا جواب واضح ہے' امریکن یونین کار بائیڈ کمپنی کو بھارت میں مزدور سستے ملتے ہیں۔ فیکٹری میں لاگت کم آتی ہے۔ منافع کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اس امریکن کمپنی نے ہمارے دیس کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو اس فیکٹری کے علاوہ دوسری فیکٹریوں میں شیئر دیئے ہیں۔ اس کمپنی کا اپنا منافع محفوظ رکھنے کے لئے اندرا کانگریس کے ایک مقامی افسر کو اس پلانٹ کا قانونی مشیر بنایا ہے۔ یہاں کے پولیس چیف کو پلانٹ کا سکیورٹی افسر بنایا ہے۔ ایک وزیر تعلیم کے بھتیجے کو پبلک ریلیشن آفیسر کا عہدہ دیا ہے اور مدھیہ پردیش کے ڈپٹی چیف سیکرٹری کے سالے کو فیکٹری میں ایک اعلیٰ افسر کی پوسٹ پر رکھا ہے۔

اس کمپنی نے فیکٹری سے کچھ فاصلے پر شیمالہ پہاڑی پر ایک بہت بڑا گیسٹ ہاؤس تعمیر کرایا ہے۔ یہ گیسٹ ہاؤس کسی شاہ کے عیش کدے سے کم نہیں ہے۔ وہاں شہر کے معززین اور اعلیٰ افسران کو دعوتیں دی جاتی ہیں۔ رات گئے تک وہاں شراب وشباب کی محفلیں جمی رہتی ہیں۔ اندرا کانگریس کی جب بھی علاقائی کانفرنس ہوتو وہاں وی آئی پی حیثیت رکھنے والی شخصیات کی رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس فیکٹری کے امریکن مالکان اور بھارتی حکمرانوں کے درمیان اتنا مضبوط رشتہ ہوگیا ہے کہ مزدور یونین اور اخبارات کی چیخ وپکار ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ یہ حکمران آخر چاہتے کیا ہیں؟ کیا دیس کی آبادی کم کرنے کے لئے ان کی نظروں میں ایک بھوپال شہر ہی رہ گیا ہے؟"

اس مضمون کی اشاعت کے تیسرے دن امجد کمار سکینہ کو سکیورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے پتا جی ایک وکیل کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچے۔ اسے بڑی سے بڑی ضمانت پر رہا کرانے کی کوشش کی لیکن گرفتار کرنے والا پولیس افسر خاص طور پر دہلی سے آیا تھا۔ اس نے پتا جی کو امجد سے ملاقات کرنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ اسے شام کی ٹرین سے دہلی لے جایا جارہا تھا۔ سلمیٰ اور ماں جی روتی ہوئی اسٹیشن آئیں۔ وہاں بھی

قریب آکر ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ کمپارٹمنٹ میں سپاہیوں کے درمیان کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ سلمیٰ نے پوچھا۔ "آخر معلوم تو ہو تمہیں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟"

امجد نے کہا۔ "جب میں نے کوئی جرم نہیں کیا تو پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں جلد ہی چھوٹ کر آؤں گا۔"

ماں جی نے کہا۔ "بیٹے! بہو نے تمہیں کوئی خوشخبری سنائی؟ یہ ماں بننے والی ہے۔"

امجد نے چونک کر مسکراتے ہوئے دیکھا۔ وہ سر جھکائے سر پر آنچل رکھ رہی تھی۔ اسی وقت ٹرین چل پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں آؤں گا سلمیٰ میں جلد ہی آؤں گا۔ ماں جی' تمہارا خیال رکھیں گی۔"

وہ کھڑکی سے سر نکالے حدِ نظر تک سلمیٰ کو دیکھتا رہا۔ پھر ٹرین دوسری طرف مڑ گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ دوسرے دن جیل میں ایک پولیس افسر نے اس کے سامنے دو اخبار لاکر پھینکے اور کہا۔ "دیکھو یہ تمہارے بارے میں کیا لکھتے ہیں؟"

اس نے اخبار کھول کر دیکھا۔ ایک جگہ لکھا ہوا تھا۔ "مشہور ومعروف جرنلسٹ امجد کمار سکینہ ملک دشمن سرگرمیوں کے دوران گرفتار کرلیا گیا۔ وہ آدھا اسلامی اور آدھا ہندو نام اپنا کر خود کو کٹر ہندوستانی اور دیش بھگت ثابت کرتا رہا۔ اس پر مقدمہ چلنے کے دوران اس کی اصلیت کو عوام کے سامنے لایا جائے گا۔"

امجد نے دوسرا اخبار بھی دیکھا۔ پھر دونوں کو افسر کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں اخبار حکومت کے چمچے ہیں۔ مجھے کوئی غیر جانبدار اخبار دکھاؤ۔ وہ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

افسر نے کہا۔ "رفتہ رفتہ سب یہی کہیں گے۔ چلو اٹھو' تمہارے کچھ دوست تمہارا انتظار کررہے ہیں۔"

اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "وہ کون ہیں؟"

افسر نے جواب نہیں دیا۔ سلاخوں سے باہر آگیا۔ دو سپاہی اسے اپنے درمیان لے کر افسر کے پیچھے چلتے ہوئے جیل خانے کے مختلف حصوں سے گزرنے لگے۔ وہاں کے

دور افتادہ حصے میں ایک الگ تھلگ کمرا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر دیکھا۔ وہاں ایک پولیس افسر چند جلاد قسم کے لوگوں کے ساتھ موجود تھا۔ کمرے کو دیکھ کر معلوم ہوگیا کہ وہ ٹارچر سیل تھا۔ وہاں انتہائی اذیتیں دے دے کر اقبالِ جرم کرایا جاتا تھا۔

اسے ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ کرسی کے ہتھوں سے دونوں ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ اس کے اگلے دوپایوں سے دونوں پاؤں بھی باندھے گئے۔ ایک آفیسر نے حکم دیا۔ ”لائٹس۔“

ہزاروں وولٹ کی دو لائٹیں اس کے چہرے پر پڑنے لگیں۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ آنکھیں بند ہوجاتی تھیں یوں لگتا تھا جیسے سورج چند فٹ کے فاصلے پر چمک رہا ہو۔ اس روشنی کی جلن، دھوپ کی شدت سے بھی زیادہ تھی۔ ایک افسر نے پوچھا۔ ”امجد کمار سکینہ جرنلزم کے علاوہ تمہاری سرگرمیاں کیا ہیں؟“

وہ چیختے ہوئے بولا۔ ”مجھ پر یہ ظلم نہ کرو میں صرف اخبارات میں لکھتا ہوں اور ضرورت کے وقت دیش کے سیاسی لیڈروں سے ملاقات کرتا ہوں۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم پاکستان کے دلال ہو، کتے ہو۔“

”یو شٹ اپ۔ تم یہ بے بنیاد الزام ثابت نہیں کرسکو گے۔ میں ایک جرنلسٹ ہوں مجھے پاکستان سے صرف اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کسی دوسرے ملک سے ہوسکتی ہے۔ میں پیدائشی بھارتی ہوں۔ مجھے صرف بھارت دیش سے محبت ہے۔ جو بات میں اپنے دیش کے خلاف کبھی سوچ نہیں سکتا، وہ تم لوگوں کا سازشی دماغ سوچ رہا ہے۔“

گرمی کی شدت سے وہ ایک منٹ کے اندر پسینے میں نہا گیا تھا۔ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”اسے بجھا دو۔ بھگوان کے لئے اسے بجھا دو۔ خدا کے لئے یہ ظلم نہ کرو۔“

وہ چیختے چیختے ہانپنے لگا۔ ایک نے حکم دیا۔ آف، لائٹس، لائٹس بجھ گئیں۔ دوسرے نے کہا۔ ”تم بھگوان کو بھی پکارتے ہو۔ خدا کا بھی واسطہ دیتے ہو۔ تمہیں بھارت سے بھی محبت ہے اور پاکستان سے بھی تمہاری دوستی ہے۔ تم دوغلے ہو۔ تمہارے نام میں بھی دوغلا پن ہے؟“

ایک افسر نے پوچھا۔ ”تم پاکستان کیوں گئے تھے؟“

”اپنے رشتے داروں سے ملنے گیا تھا۔ پانی۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ پانی دو۔“

ایک جلاد نے چمڑے کے بیلٹ سے مارنا شروع کیا۔ وہ کرسی پر بندھا ہوا تڑپ رہا تھا۔ مچل رہا تھا۔ چیخیں مار رہا تھا۔ ایک افسر نے کہا۔ ”ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ تمہارے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہ ہو، ورنہ ہم پانچ منٹ میں تم سے اصلیت اگلوا لیتے۔ اب بھی سلامتی چاہتے ہو تو اعتراف کرو، تم رشتے داروں سے نہیں، وہاں کے ایک فوجی افسر اور حکمران پارٹی کے ایک ممبر سے ملنے گئے تھے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“

اسے پھر مار پڑنے لگی۔ دوبارہ لائٹس آن کی گئیں۔ اب تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ چیخ رہا تھا۔ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ آخر کب تک حلق پھاڑ سکتا تھا۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ لائٹس بجھا دی گئیں۔ افسر نے کہا۔ ”پاکستان میں ایک فوجی افسر اور حکمران پارٹی کے ممبر کے ساتھ تمہاری ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کی تصویریں ہمارے پاس ہیں۔“

اسے وہ تصویریں دکھائی گئیں جن افراد کا ذکر کیا گیا تھا، تصویروں میں امجد ان سے مصافحہ کررہا تھا۔ ان کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ ان سے باتیں کررہا تھا۔ امجد نے کہا۔ ”میرے پھوپا وہاں ٹریڈ یونین کے چیئرمین ہیں۔ انہوں نے ایک تقریب میں ان افراد سے میری ملاقات کرائی تھی۔ یہ محض ایک رسمی سی ملاقات تھی.......... آپ اسے سیاسی رنگ کیوں دے رہے ہیں؟“

جواب میں پھر مار پڑنے لگی۔ اب اس میں برداشت کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ ذرا سی دیر میں اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے منہ پر پانی چھینکا جارہا تھا۔ وہ جلدی جلدی زبان باہر نکال کر پانی چاٹنے لگا۔ ایک افسر نے کہا۔ ”اسے پانی پلاؤ۔“

تھوڑی دیر بعد کسی نے پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگایا۔ اس نے جلدی سے دو چار گھونٹ پیئے۔ پھر پانی منہ سے نکل کر باہر آنے لگا۔ اس کا حلق جلنے لگا تھا۔ ابکائی سی آرہی تھی کیونکہ پانی میں نمک ملایا گیا تھا۔

ایک افسر نے کہا۔ "امجد کمار سکینہ! آج ٹارچر سیل کا پہلا دن ہے۔ آئندہ تمہیں بیلٹ سے نہیں مارا جائے گا۔ ہمیں مارپیٹ کے بغیر ظلم و تشدد کے ایسے طریقے آتے ہیں کہ تم کسی بھی اذیت کو چند سیکنڈ برداشت نہیں کرسکو گے تمہاری روح پھڑپھڑا کر جسم سے نکلنا چاہے گی مگر ہم تمہیں مرنے بھی نہیں دیں گے۔"

دوسرے افسر نے کہا۔ "کل ٹھیک اسی وقت تمہیں یہاں لایا جائے گا۔ تب تک اپنی زندگی پر ترس کھاؤ۔ تحریری بیان دے دو کہ تم بھارت میں ایک پاکستانی ایجنٹ ہو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں' تم پر مقدمہ نہیں چلائیں گے۔ اگر تم وعدہ کرو کہ حکومت کے خلاف کبھی کچھ نہیں لکھو گے اور اپوزیشن پارٹیوں کا ساتھ نہیں دو گے تو ہم بیان دیں گے کہ غلط فہمی کی بنا پر تمہیں گرفتار کیا گیا تھا للذا باعزت طور پر بری کردیا گیا ہے۔"

اسے چار سپاہیوں نے اٹھا کر پھر قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے لاکر ڈال دیا۔ اس قید خانے سے باہر سلمٰی اپنے ساس سسر کے ساتھ دہلی آئی تھی۔ پہلے اس نے امجد سے ملاقات کی درخواست دی جو نامنظور کی گئی۔ اس نے جرنلسٹ ایسوسی ایشن سے رجوع کیا۔ تمام جرنلسٹ اور اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈر امجد کمار سکینہ کی رہائی کا مطالبہ کرنے لگے جواب میں امجد کی وہ تصویریں شائع کرائی گئیں جن میں وہ پاکستان کے ایک فوجی افسر اور حکمران پارٹی کے ایک ممبر سے ملاقات کر رہا تھا۔

لیکن وہ تصویریں ٹھوس ثبوت نہیں تھیں۔ پھر بھی رہائی کا مطالبہ کرنے والوں کو عدالتی کارروائی کا انتظار کرنا پڑا۔ انہوں نے امجد سے ملاقات کا مطالبہ کیا۔ جواب ملا' امجد کمار سکینہ بھارت کے خلاف ٹاپ سیکرٹ معاملات میں ملوث ہے۔ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

جب معاملہ عدالت میں پہنچا تو مقدمے کی کارروائی یہ کہہ کر ملتوی کرائی گئی کہ امجد بہت بیمار ہے' عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا اور واقعی اس کی حالت بہت نازک تھی۔

ایک ماہ میں اسے تین بار ٹارچر سیل میں پہنچایا گیا۔ اس پر ظلم و تشدد کی انتہا کردی گئی۔ وہ جسمانی طور پر پہلے سے آدھا ہوگیا تھا۔ آنکھیں دھنس گئی تھیں۔ چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کمزور پڑ گئی تھیں۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہوتی رہتی

تھی۔ وہ کسی خاص سوچ و فکر کے بغیر یونہی خلا میں تکتا رہتا تھا۔

اسے چوتھی بار ٹارچر سیل میں لایا گیا تو وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "مار ڈالو۔ مجھے مار ڈالو۔ آخر کب تک تھوڑا تھوڑا کرکے مارو گے؟ دیکھو میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے ہیں۔ میں تمہارے کسی کاغذ پر دستخط کرنے کے قابل نہیں رہا۔ تمہارا ظلم مجھے بے دست و پا بنادے گا پھر تم مجھ سے کچھ حاصل نہیں کرسکو گے۔"

اس کے منہ پر زور کا طمانچہ پڑا۔ پھر اسے کرسی سے باندھ کر کہا گیا۔ "تمہارے جرنلسٹ اور اخبارات ہمارے خلاف قانونی کارروائی نہیں کرسکیں گے۔ اگر تم مرجاؤ گے تو تمہاری لاش غائب کردی جائے گی اور یہ مشہور کیا جائے گا کہ تم ایک بدنام مجرم کے ساتھ جیل سے بھاگ گئے۔ پولیس تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ جیل سے فرار ہونے والے ایسے کچھ مجرم ہیں جنہیں پولیس والے کبھی تلاش نہ کرسکے نہ ہی ان کا کوئی سراغ مل سکا۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔"

وہ خواہ مخواہ کسی جرم کے اعتراف نامے پر دستخط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بار اسے بجلی کا جھٹکا پہنچایا گیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر ایسے چیخنے لگا جیسے ذبح کیا جارہا ہو۔ پہلے ہی جھٹکے میں اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ افسر نے کہا۔ "بولو تم پاکستان کے جاسوس ہو۔ ہندوستان میں رہ کر ہندوانے نام سے دھوکا دیتے ہو۔ پاکستان جاکر اپنے مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہو۔"

وہ تڑپ کر بولا۔ "ہاں' میں مسلمان ہوں مگر اپنے بھارت دیش کا غدار نہیں ہوں۔ تم کبھی یقین نہیں کرو گے تمہیں یہاں کے وفادار مسلمان بھی پاکستانی جاسوس دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا' ہندوستان کو تقسیم نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اب کہتا ہوں' پاکستان کا وجود ضروری تھا تم لوگوں نے اپنے ظلم و ستم سے اور ناانصافیوں سے مسلمانوں کو پاکستان بنانے پر مجبور کردیا۔ پاکستان بنانے والوں کو تم بجلی کے جھٹکے نہیں پہنچا سکتے۔ ان کا انتقام ہم سے لے رہے ہو۔ اس کے لئے ٹارچر سیل میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے سیاسی دستور کے مطابق پھر کسی شہر میں ہندو مسلم فسادات برپا کراؤ۔ سینکڑوں' ہزاروں مسلمانوں کی طرح میں بھی کسی فساد میں مارا جاؤں گا۔ تم ہی مجھے فسادی کہہ کر گولی مار سکو گے۔"

اس کے حلق سے چیخ نکلی پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔ اسے پھر بجلی کا جھٹکا پہنچایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔ پھر کہا۔ ”کافی ہے‘ مزید شاک نہ پہنچاؤ۔ یہ مرجائے گا یا اس کا ذہنی توازن بگڑ جائے گا۔“

وہ سب اسے وہیں چھوڑ کر باہر آئے۔ ایک کمرے میں اعلیٰ افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس کا ذہنی توازن بگڑ جانا چاہئے۔ یہ معاملہ طول پکڑ رہا ہے۔ اسے جلد ختم کرو۔ کسی نتیجے پر پہنچاؤ۔“

تھوڑی دیر صلح مشورے ہوتے رہے۔ اس کے مطابق ایک جونیئر افسر نے گیس ماسک پہنا پھر ایک گیس سلنڈر اور اسپرے گن لے کر ٹارچر سیل میں آیا۔ امجد ہوش میں آگیا تھا۔ کمزوری کے باعث اس کی گردن ہل رہی تھی۔ وہ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔ افسر نے پوچھا۔ ”کیا بول رہے ہو؟“

امجد پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ افسر نے کہا۔ ”ذرا رو کر دکھاؤ۔“

وہ پھر ہنسنے لگا۔ افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ وقتی پاگل پن ہے۔ میں آخری مینٹل ٹارچر کے ذریعے تمہیں مستقل پاگل بنا رہا ہوں۔ یہ سلنڈر دیکھ رہے ہو۔ اس میں وہ میتھائل ایسوسائٹ ہے۔ جس کے خلاف تم نے زہر اگلا تھا۔ یہ زہر آج تمہارے دماغ میں اور پھیپھڑوں میں پہنچے گا پھر تم کسی کے سامنے شعوری طور پر بیان دینے کے قابل نہیں رہو گے۔“

اس نے ماسک پہن لیا پھر ایک مخصوص مقدار میں گیس اسپرے کرکے ردعمل دیکھنے لگا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ کبھی سانس روک رہا تھا۔ بند آنکھوں سے تیزی کے ساتھ پانی بہہ رہا تھا۔ اس کے حلق سے کمزور سی کراہیں نکل رہی تھیں۔ افسر نے دروازہ کھول کر چھت کے پنکھے کو آن کردیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے آکر معائنہ کیا۔ پھر سپاہیوں سے کہا۔ ”اسے لے جاؤ۔“

دوسرے دن اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ امجد کمار سکینہ عدالت میں حاضر ہونے کے خوف سے خود کو پاگل ظاہر کررہا ہے۔ دماغی امراض کے ماہرین کے مشورے

کے مطابق اسے ایک مینٹل اسپتال میں داخل کردیا گیا ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہی سلمیٰ‘ ماں جی اور پتا جی اسپتال پہنچے۔ انہیں ملنے کی اجازت دی گئی۔ انہوں نے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اسے دیکھا۔ وہ پہچانا نہیں جارہا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔

سلمیٰ اس کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔ ماں جی پولیس والوں کو کوس رہی تھیں۔ پتا جی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بھرائی ہوئی آواز میں مخاطب کیا۔ ”میرے بچے! یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے؟“

وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ کسی خیال میں گم تھا۔ مخاطب کرنے پر اپنا ہاتھ چھڑا کر بولا۔ ”خبردار! کون ہو تم؟“

”بیٹے میں تمہارا باپ ہوں۔“

”جھوٹ بولتے ہو۔ سچ بتاؤ۔ تم ہندو ہو یا مسلمان؟“

”میں ہندو ہوں‘ تم مسلمان ہو مگر یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں معلوم کرنا چاہتا ہوں‘ میں کون ہوں؟“

سلمیٰ نے پاس آکر کہا۔ ”ہم دونوں مسلمان ہیں۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔“

وہ بستر پر ذرا پیچھے کھسک کر بولا۔ ”جھوٹ بولتی ہو۔ تم ہندو ہو۔ میری بیوی تو مجھے نماز پڑھاتی ہے۔“

ماں جی نے روتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اپنے چھوٹے سے گھر کو ایک مثالی ہندوستان بنایا تھا۔ ہم پتی پتنی اس گھر میں پوجا کرتے تھے‘ تم میاں بیوی نماز پڑھا کرتے تھے۔ ہمارے ذہنوں میں کبھی یہ سوال نہیں ابھرا کہ کون ہندو ہے کون مسلمان ہے؟ تم کون کون سے عذاب سے گزر کر آئے ہو کہ تمہارے دماغ میں ہندو اور مسلمان کا سوال نقش ہوگیا ہے۔“

پتا جی نے کہا۔ ”اس کے سامنے زیادہ نہ بولو۔ یہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ بھگوان سے پرارتھنا کرو‘ ہمارا بیٹا نارمل ہوجائے۔“

انہوں نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ان سے درخواست کی‘ اسے گھر لے جاکر علاج کرائیں گے لیکن ابھی وہ پولیس کسٹڈی میں تھا پتا جی نے پھر وکیل کے ذریعے عدالت

میں درخواست دی۔ اخبارات پھر اس کی رہائی کے لئے شور مچانے لگے۔ تقریباً چھ ماہ بعد عدالت نے ضمانت پر رہا کرنے کی اجازت دے دی۔ رہائی کے لئے شرائط یہ تھیں کہ نارمل ہونے کے بعد امجد کمار سکینہ عدالت میں حاضر ہوگا اور جرنلسٹ ایسوسی ایشن کا چیئرمین اسے عدالت میں پیش کرے گا۔

آخر پتا جی اسے رہا کراکے بھوپال لے آئے۔ دماغی امراض کے ایک ڈاکٹر سے علاج کرانے لگے۔ سلمیٰ دن رات اس کا خیال رکھا کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا' اسے رفتہ رفتہ ماضی کی باتیں یاد دلائی جائیں۔ بیوی اور ماں باپ اپنے طور پر کوشش کرتے رہتے تھے مگر اسے اپنا نام یاد آجانے کے باوجود یہ یاد نہیں آتا تھا کہ وہ کون ہے؟ ہندو یا مسلمان؟

سلمیٰ کی زچگی کے دن قریب تھے۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتی تھی۔ "میں تمہاری اولاد کو جنم دینے والی ہوں۔ خدا کے لئے خود کو پہچانو۔ میں عورت ہوں۔ زچگی کے بعد یہ مان چاہتی ہوں کہ تم بچے کو ہاتھوں میں لے کر میری تعریف کرو اور ایک جیتا جاگتا تحفہ دینے پر مجھے پہلے سے زیادہ پیار کرو۔ امجد! خدا کے لئے میرا مان رکھ لو۔"

وہ کچھ سمجھتا نہیں تھا۔ کبھی کبھی گھر سے نکل کر پریشانی کا سبب بن جاتا تھا پتا جی اسے ڈھونڈ کر لاتے تھے ایک شام اندھیرا ہوتے ہی وہ گھر سے کہیں چلا گیا۔ بوڑھا باپ پھر اسے تلاش کرنے نکلا۔ آدھی رات ہوگئی' وہ نظر نہیں آیا۔ رات کو سلمیٰ دردِ زہ میں مبتلا ہوگئی تھی۔ محلے کی ایک دائی نے بتایا' صبح تک زچگی ہو سکتی ہے۔ ماں جی اسے اسپتال لے جانے کے لئے ایک ٹیکسی لے آئیں۔ جب وہ بہو کو سہارا دے کر ٹیکسی میں بٹھا رہی تھیں تو سر چکرا گیا۔ سبھی نے اپنی سانسوں میں انگاروں جیسی جلن محسوس کی۔ سلمیٰ پچھلی سیٹ پر گر پڑی تھی۔ محلے کی عورتیں اور بچے چیخ رہے تھے۔ مرد بھاگتے پھر رہے تھے۔ ڈرائیور نے گھبرا کر ٹیکسی اسٹارٹ کی پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ہوا کی تلاش میں جانے لگا۔ اس کا رخ اسپتال کی طرف تھا۔ اس نے سوچا' تازہ ہوا نہ ملی تو وہ راستہ بدل کر دوسری طرف جائے گا۔

زہریلی گیس شمال سے جنوب کی سمت محدود علاقوں سے گزر رہی تھی۔ اس کا رخ

اسپتال کی طرف نہیں تھا۔ کتنے ہی لوگ ادھر بھاگتے چلے آرہے تھے۔ ڈرائیور وہاں پہنچتے ہی دروازہ کھول کر ٹیکسی سے باہر گر پڑا۔ اسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے اسے سہارا دیا۔ دو وارڈ بوائے سلمیٰ کو اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔ چونکہ وہ حاملہ تھی اس لئے لیڈی ڈاکٹر نے پہلے اسے اٹینڈ کیا۔ پھر بولی۔ "بچہ پیٹ میں ساکت ہوچکا ہے۔ اسے آپریشن کے لئے لے چلو۔"

وہ بچہ جو ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا اور جسے جنم دے کر سلمیٰ ایک عورت کا مان حاصل کرنا چاہتی تھی' وہ پیدا ہونے سے پہلے ہی زہریلی گیس کا شکار ہوگیا تھا۔

☆------☆------☆

وہ بستر پر سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اخباری رپورٹر ارون ورما نے کہا۔ "بھابی آپ پر اور امجد کمار سکینہ پر جو ظلم ہوا ہے' اس کے لئے سوچنا ہوگا کہ بھوپال کی گیس زہریلی ہے یا ہمارے حکمران زہریلے ہیں؟" پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں اس معصوم بچے کو واپس نہیں لا سکتا مگر امجد بھائی کو کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ آپ آنکھیں بند کرکے آرام کریں۔ آنکھیں زیادہ کھلی رکھیں گی تو تکلیف بڑھ جائے گی۔"

وہ بستر پر لیٹ کر بولی۔ "بھائی' میری آنکھوں میں دوائی ڈال دو۔"

ارون ورما نے اس کی آنکھوں میں دوا کے چند قطرے ڈالے۔ وہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ اسی وقت کامنا دوسری مریض عورتوں کو دیکھتی ہوئی سلمیٰ کے پاس آئی' ارون ورما سے بولی۔ "کیا تمہارا تعلق اسپتال سے ہے؟"

"جی نہیں' میں اخباری رپورٹر ہوں۔"

"تم آنکھوں میں کون سی دوا ڈال رہے تھے؟"

"یہ اسپتال والوں نے دی ہے۔"

کامنا نے دوا لے کر دیکھی' پھر مطمئن ہوکر بولی۔ "یہ تمہاری کون ہیں؟"

"ان سے میرا خون کا رشتہ نہیں ہے۔ میں اس کے پتی کا عقیدت مند ہوں۔ وہ بہت مشہور جرنلسٹ ہیں۔ آپ نے امجد کمار سکینہ کا نام سنا ہوگا۔"

کامنا نے چونک کر سلمیٰ کو دیکھا پھر کہا۔ "میں آج ان کے پتی سے مل کر آئی

ہوں۔"

سلمٰی نے آنکھیں کھول دیں۔ فوراً ہی اٹھ کر بولی۔ "کہاں ہیں وہ؟ مجھے ان کے پاس........"

وہ بات پوری نہ کر سکی۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے کامنا نے اسے لٹاتے ہوئے کہا۔ "صبر کرو ہم نے امجد صاحب کو یہاں بلوایا ہے۔ میرے پتی ماہر نفسیات ہیں۔ وہ تمہارے پتی کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو وہ نارمل ہو جائیں گے۔"

وہ سلمٰی کی آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد بولی۔ "آنکھیں بند کر کے لیٹی رہو۔ آرام آجائے گا۔ جیسے ہی امجد صاحب آئیں گے، میں انہیں تمہارے پاس لے آؤں گی۔"

اسپتال کے باہر ایک گاڑی آکر رکی۔ اس میں مریضوں کے لئے دوائیں وغیرہ لائی گئی تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر کامنا کماری کے حکم کے مطابق امجد کمار سکینہ کو بھی پکڑ کر لایا گیا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر اسپتال کو یوں دیکھنے لگا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو........ حالانکہ اس اسپتال کو بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ وہاں کا تمام عملہ اسے پہچانتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے قریب آکر کہا۔ "سکینہ صاحب! آپ ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ خود کو پہچان نہیں سکتے۔ پھر بھی میرا فرض ہے، میں آپ کی ماں جی اور پتا جی کا دیدار کرادوں۔"

وہ اسے لے جاکر مردہ خانے میں آیا۔ دو لاشوں پر سے چادریں ہٹائیں۔ اس کی ماں جی اور پتا جی ہمیشہ کے لئے شانت ہو گئے تھے۔ امجد نے قریب جاکر انہیں دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیا یہ مر چکے ہیں؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "جی ہاں۔ آپ نے انہیں پہچان لیا ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں۔ آپ بتائیں، یہ ہندو تھے یا مسلمان؟"

ڈاکٹر نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے لاشوں پر چادر ڈال کر دیکھا تو امجد نہیں تھا۔ اس نے آواز دی۔ "ارے، آپ کہاں گئے ہیں؟"

وہ ایک وارڈ میں جا پہنچا تھا وہاں ایک بستر پر دیال ماسٹر لیٹے ہوئے تھے۔ شانتا ان کے

سرہانے بیٹھی آہستہ آہستہ سر دبا رہی تھی۔ دیال ماسٹر نے اسے آواز دی۔ "ارے بھائی! ذرا ادھر آؤ۔ میری بات سنو۔"

امجد اُن کی طرف آنے لگا۔ شانتا نے کہا۔ "باپو! تم ہر ایک سے ایک ہی بات کہتے ہو۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

وہ ڈانٹ کر بولے۔ "خاموش رہو۔ بڑوں کے معاملات میں نہ بولا کرو۔"

امجد قریب آیا۔ انہوں نے کہا۔ "آؤ بیٹا! یہاں بیٹھو۔ یہ میری بیٹی شانتا ہے۔"

"یہ ہندو ہے یا مسلمان؟"

وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "عورت کی کوئی ذات نہیں ہوتی، شادی کے بعد اسے جو بناؤ گے وہ بن جائے گی۔ تم شادی کرلو۔ اس کی عمر نہ دیکھو۔ میں دس برس کم کردوں گا۔ یہ تمہاری دلہن بن کر بیس برس کی ہو جائے گی۔"

شانتا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ امجد سے بولی۔ "ان کے دماغ پر زہریلی گیس نے اثر کیا ہے۔ انہیں صرف ایک ہی اہم بات یاد رہ گئی ہے۔ یہ ہر آنے والے کے سامنے میری عمر دس برس کم کرتے رہتے ہیں۔ پلیز! آپ چلے جائیں۔"

اسی وقت ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر کامنا کے ساتھ آیا اور کہا۔ "وہ رہے سکینہ صاحب۔"

کامنا نے قریب آکر کہا۔ "مسٹر امجد! یہ نہ پوچھنا کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان۔ چلو میرے ساتھ۔ تمہاری بیوی اسی اسپتال میں ہے۔"

وہ اٹھ کر بولا۔ "میری بیوی نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "تم تو بہت اچھے ہو۔ بات مان لیتے ہو۔ تم اسے نہیں پہچانتے، وہ تو تمہیں پہچانتی ہے۔ اپنے لئے نہیں اس کے لئے چلو۔"

وہ کامنا اور ڈاکٹر کے درمیان چلتا ہوا اس وارڈ سے نکل کر زنانہ وارڈ میں آیا پھر سلمٰی کے بستر کے پاس رک گیا۔ کامنا نے کہا۔ "سلمٰی بیگم! آہستہ آہستہ آنکھیں کھولو، دیکھو، تمہارا امجد آیا ہے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں کو آہستہ آہستہ کھولا پھر بند کرلیا۔ پھر انہیں کھولتے ہوئے اِدھر اُدھر گھمانے لگی۔ اس کے بعد چیخ کر بولی۔ "نہیں! میں دیکھنا چاہتی

ہوں۔ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ میری زندگی میں دیکھنے کے لئے وہی ایک رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر! تمہیں خدا کا واسطہ میری آنکھوں کے سامنے سے یہ اندھیرا دور کر دو۔"

کامنا' ڈاکٹر اور ارون ورما پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ سلمیٰ کہہ رہی تھی۔ "امجد! تم کہاں ہو؟ ماں جی اور پتا جی کو زہریلی گیس نے کھا لیا۔ میرے اندر سے ہمارا بچہ نہیں زہریلی گیس کا لوتھڑا نکلا۔ ظالموں نے تمہارا دماغی توازن بگاڑ دیا۔ میں تمہیں دیکھنے کے لئے زندہ تھی۔ اب تم بھی نظر نہیں آتے۔ میں تمہیں دیکھوں گی۔ میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں ضرور دیکھوں گی۔"

وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ کامنا اور ڈاکٹر اسے دو طرف سے پکڑ کر سمجھا رہے تھے مگر وہ امجد کو دیکھنے کے لئے مچل رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ پھر تڑپتے تڑپتے ان کی گرفت میں یکایک خاموش ہو گئی۔ اس کی باچھوں سے خون رسنے لگا تھا۔ پھیپھڑے پہلے ہی ناکارہ ہو چکے تھے۔ دل صدمات سے پھٹ گیا تھا۔ کامنا اور ڈاکٹر نے ایک دوسرے کو جھکی جھکی نظروں سے دیکھا' اسے بستر پر لٹا کر معائنہ کیا پھر اس اندھی کے وجود کو چادر سے ڈھانپ دیا۔

امجد کمار سکسینہ زندگی کے اس آخری اسٹیشن پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے تمام اپنے رخصت ہو چکے تھے۔ کسی دن اس کے پھیپھڑے بھی جواب دینے والے تھے۔ فی الحال وہ خود سے بیگانہ ہو کر سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "بے چاری مر گئی۔ پتا نہیں ہندو تھی یا مسلمان؟"

ارون ورما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کامنا کی آنکھیں بھی چھلک رہی تھیں اور ڈاکٹر کا سر جھک گیا تھا۔ وہ آخری اسٹیشن سے کسی کو واپس نہیں لا سکتا تھا۔

☆======ختم شد======☆

محی الدین نواب کے لازوال قلم سے مقبول ترین شاہکار کتابیں

Rs. 100.00

ISBN 969-517-026-9

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور